دارالعلوم دیوبند کا ترجمان

ماہنامہ

دارالعلوم

جلد: ۱۰۷	ربیع الثانی - جمادی الثانی ۱۴۴۵ھ مطابق نومبر - دسمبر ۲۰۲۳ء	شمارہ: ۱۱-۱۲

نگراں	مدیر
حضرت مولانا مفتی ابوالقاسم صاحب نعمانی مہتمم دارالعلوم دیوبند	مولانا محمد سلمان صاحب بجنوری استاذ دارالعلوم دیوبند

ترسیل زر کا پتہ: دفتر ماہنامہ دارالعلوم دیوبند - ۲۴۷۵۵۴ یوپی

Tel. : 01336-222429 Fax : 01336-222768
Web : http://www.darululoom-deoband.com
https://darululoom-deoband.com/urdumagazine
E-mail: info@darululoom-deoband.com

DARUL ULOOM Monthly (Urdu)
R. N. I. No.: 2133/57
Vol. No. 107, Issue No. 11-12, Nov.-Dec. 2023 نومبر–دسمبر 2023
Published by Maulana Abul-Qasim Numani
Printed by Maulana Abul-Qasim Numani
Editor :- Maulana Mohammad Salman Bijnori
On Behalf of Darul Uloom Grush.
Place of Publication :- Deoband, Saharanpur, U.P.
Printed at: Mukhtar Printing Press Mohalla Bar Ziyaul Haq
Talehari Chungi. Deoband, Saharanpur. U.P.

Rs. 60/=	Annual Subscription Rs. 300/=

Annual by Regd Post. Rs. 540/=

سعودی عرب، افریقہ، برطانیہ، امریکہ، کناڈا وغیرہ سے سالانہ -/۱۵۰۰ روپے
بنگلہ دیش سے سالانہ -/۸۰۰ روپے، پاکستان سے ہندوستانی رقم -/۸۰۰ روپے

فہرست مضامین

حرف آغاز		محمد سلمان بجنوری	۳
گوشۂ فلسطین	مسجد اقصیٰ کی حفاظت اور ہماری ذمہ داری	حضرت مولانا مفتی ابوالقاسم نعمانی	۵
	مسجد اقصیٰ کی فضیلت واہمیت	مولانا ابوبکر حنفی شیخوپوری	۹
	اسرائیل کے قیام اور بقا کی جدوجہد	مولانا زاہد الراشدی	۱۴
	غزہ پر مظالم اور ہماری ذمہ داریاں	مولانا خالد سیف اللہ رحمانی	۲۰
	فلسطین...تاریخ کے آئینے میں	مولانا یزید احمد نعمانی	۲۵
	اسرائیل-فلسطین کا قضیہ کیا ہے؟	جناب اشتیاق احمد ربانی علی گڑھ	۳۰
	قضیۂ فلسطین اور موروثیت	پروفیسر ڈاکٹر انیس احمد	۳۳
	فلسطین اور اسرائیل جنگ کی مکمل ہسٹری	سفیان علی فاروقی، قطر	۳۸
	غزہ، ''تہذیبوں کے چوراہے'' کی تاریخ	سجاد اظہر	۴۴
	فلسطین پر اسرائیلی قبضے کی مختصر تاریخ		۴۸
	غزہ کی پٹی یا کھلی جیل؟		۵۳
	قتل گاہِ غزّہ سے آخری پیغام	حامد میر	۵۶
	علامہ کشمیریؒ، شرح حدیث منہج وخصوصیات	مولانا محمد اجمل قاسمی	۵۹
	رائے، اہل رائے اور فقہائے حنفیہ	مولانا عبید الرحمٰن	۶۴
	فخر ہند علامہ ابوالحسنات عبدالحئی لکھنویؒ	مفتی عبید اللہ قاسمی بہرائچی	۷۳
	''تذکرۃ الرشید'' کا علمی وادبی مطالعہ	ڈاکٹر مولانا اشتیاق احمد قاسمی	۸۳
احوال وکوائف	اجلاس مجلس عاملہ رابطۂ مدارس اسلامیہ عربیہ	مرکزی دفتر رابطہ مدارس اسلامیہ عربیہ	۱۰۷

ختم خریداری کی اطلاع

- ○ یہاں پر اگر سرخ نشان ہے تو اس بات کی علامت ہے کہ آپ کی مدت خریداری ختم ہوگئی ہے۔
- ● ہندوستانی خریدار منی آرڈر سے اپنا چندہ دفتر کو روانہ کریں۔
- ● ایک سال کے لیے اگر بذریعہ رجسٹری طلب فرمائیں تو =/540 روانہ فرمائیں۔
- ● ہندوستان و پاکستان کے تمام خریداروں کو خریداری نمبر کا حوالہ دینا ضروری ہے۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم

حرف آغاز

محمد سلمان بجنوری

ایک بار پھر کارزارِ فلسطین میں، حق و باطل، نبرد آزما ہیں اور ہمیشہ کی طرح کھرے کھوٹے کی پہچان واضح ہورہی ہے، ایسا لگتا ہے کہ غزوۂ بدر کی مناسبت سے قرآن کریم میں جوارشاد فرمایا گیا تھا لِّيَهْلِكَ مَنْ هَلَكَ عَن بَيِّنَةٍ وَّيَحْيَىٰ مَنْ حَيَّ عَنْ بَيِّنَةٍ کہ جو ہلاک اور برباد ہووہ بھی حجت تام ہونے اور حق واضح ہونے کے بعد ہو اور جو زندۂ جاوید رہے یا آباد ہووہ بھی حق واضح ہونے کے بعد ہو، یہ ارشاد ہر دور میں برپا ہونے والے معرکوں کے لیے قاعدۂ کلیہ کی حیثیت رکھتا ہے۔

فلسطین کا مسئلہ، دنیا کے تمام انصاف پسندوں کا متفقہ طور پر تسلیم شدہ مسئلہ ہے، جس میں فلسطینی حق پر ہیں اور مظلوم ہیں اور اسرائیل ناحق اور ظالم ہے، دنیا کا کوئی قانون اور اقوام متحدہ کی کوئی قرارداد، اس سے اختلاف نہیں کرتی؛ لیکن اسرائیل کے عالمی سرپرستوں اور ان کے پابند مسلم حکمرانوں کا رویہ بالکل مختلف ہے۔

اس سلسلے میں حالیہ جنگ کے دوران، جو واقعات پیش آئے مثلاً یہ کہ امریکی صدر کی قیادت میں دنیا کے طاقت ور ملکوں نے ضروری سمجھا کہ اسرائیل کو ظلم سے روکنے میں اپنا کردار ادا کرنے کے بجائے اس کے ساتھ یک جہتی کا کھلم کھلا اظہار کریں، اس کے یہاں حاضری دے کر اپنی تائید وحمایت درج کرائیں اور اپنا نامۂ اعمال مزید سیاہ کریں، یا یہ کہ عرب ملکوں کی حکومتوں نے مرعوبانہ تجاویز اور کھوکھلے الفاظ استعمال کرنا کافی سمجھا اور ان بدترین حالات میں بھی اسرائیل کے لیے کوئی خطرہ پیدا کرنا، اس کے منصوبوں میں کوئی رکاوٹ کھڑی کرنا یہاں تک کہ تیل کی فراہمی بند کرنا یا کم از کم اس کے حوالے سے کوئی دباؤ ڈالنا بھی مناسب نہیں سمجھا، یہ اور اسی طرح کے واقعات، حد درجہ افسوس ناک تو ہیں؛ لیکن حیرت ناک بالکل نہیں ہیں۔

جو لوگ گزشتہ سو برس کی تاریخ سے واقف ہیں اور اس دوران عالم اسلام میں ہونے والی

تبدیلیاں اُن کی نظر میں ہیں، اُن کو خبر ہے کہ موجودہ عرب حکمرانوں کی پالیسیاں، سو برس پہلے کے واقعات کا منطقی نتیجہ ہیں۔ جس انداز سے پہلے برطانیہ اور پھر امریکہ نے اس پورے خطے میں ملکوں کی تقسیم اور پھر مختلف خاندانوں یا گروپوں میں حکومتوں کی تقسیم کا کام کیا تھا اور تمام اسلامی ملکوں میں رونما ہونے والی حقیقی تحریکات اور وہاں کی اصل نمائندہ قوتوں اور جماعتوں کو دبایا اور تہِ تیغ کیا تھا، اس کے بعد موجودہ حکمرانوں کا رویہ یہی ہوسکتا تھا، اس سے مختلف ہوتا تو باعث تعجب ہوتا۔

اس وقت صورت حال یہ ہے کہ امت الگ ہے، ریاست الگ ہے، ساری امت مسلمہ فلسطینی مسلمانوں کے ساتھ ہے اور دنیا کی انصاف پسند قوتیں اور عوام بھی اُن کی تائید میں ہیں؛ لیکن مسلم حکومتوں کا موقف دوسرا ہے۔ یہاں ایک اور حقیقت پر توجہ کی ضرورت ہے اور وہ یہ کہ اس وقت دنیا میں پروپیگنڈہ سب سے بڑی طاقت بنتا جارہا ہے، یہ پروپیگنڈہ ہی کی طاقت ہے کہ فلاں اور فلاں تنظیم دہشت گرد ہے خواہ وہ کیسے ہی منصفانہ کاز کے لیے کام کررہی ہو اور فلاں اور فلاں تحریکات، امن کی علم بردار ہیں خواہ اُن کے ہاتھ کتنے ہی بے قصوروں کے خون سے رنگین ہوں۔ اس بات کو سامنے رکھ کر، اُس رویہ کو سمجھنا بھی آسان ہوگا جو عرب حکومتوں نے اختیار کیا اور اُس صورت حال کو بھی جو ہمارے ملک میں پیدا ہوئی کہ ہمارے منصفانہ سرکاری موقف کے بالکل خلاف ماحول بنایا گیا اور مسائل کھڑے کیے گئے۔

سچی بات یہ ہے کہ فلسطین اسرائیل تنازعہ کے سلسلے میں کوئی ایسی بات باقی نہیں ہے جو کسی سے کہی جائے یا سمجھائی جائے، بس ضرورت اس بات کی ہے کہ انصاف کو طاقت دی جائے یا طاقت کو انصاف دے دیا جائے۔

* * *

مسجد اقصیٰ کی حفاظت اور ہماری ذمہ داری

حضرت مولانا مفتی ابوالقاسم نعمانی دامت برکاتہم
مہتمم وشیخ الحدیث دارالعلوم دیوبند

فلسطین، مسجد اقصیٰ اور سرزمین قدس کے ساتھ مسلمانوں کا جو ایمانی وجہ باقی تعلق ہے وہ ایسا نہیں ہے کہ اس کو فراموش کر دیا جائے۔ مسجد اقصیٰ کے سلسلہ میں قرآن پاک میں اللہ تعالیٰ نے مستقل آیتیں نازل فرمائی ہیں: سُبْحَانَ الَّذِیْ أَسْرَی بِعَبْدِہٖ لَیْلًا مِنَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ إِلَی الْمَسْجِدِ الْأَقْصَی الذی بَارَکْنَا حَوْلَہٗ لِنُرِیَہٗ مِنْ آیَاتِنَا إِنَّہٗ ھُوَ السَّمِیعُ الْبَصِیر (الاسراء:۱)

ترجمہ: پاک ہے وہ ذات جو اپنے بندے کو رات ہی رات میں مسجد حرام سے مسجد اقصیٰ تک لے گئی جس کے آس پاس ہم نے برکت دے رکھی ہے؛ تاکہ ہم اسے اپنی قدرت کے بعض نمونے دکھائیں یقیناً اللہ تعالیٰ ہی خوب سننے دیکھنے والا ہے۔

اس آیت میں مسجد اقصیٰ کا ذکر ہے نیز مسجد اقصیٰ کے ماحول اور اردگرد کی زمین کے مبارک ہونے کا تذکرہ ہے۔ آیت کا اصل مقصد تو نبی کریم ﷺ کے سفرِ اسراء اور سفر معراج کو بیان فرمانا ہے؛ لیکن اسی کے ضمن میں اگلی آیتوں میں یہودیوں اور بنی اسرائیل کے عروج وزوال کی داستانیں بھی بیان کی گئیں ہیں۔

تاریخی مطالعہ

تاریخ کا مطالعہ کیا جائے تو اندازہ ہوگا کہ مسجد اقصیٰ کے ساتھ کئی اہم واقعات مربوط ہیں۔ یہ نبی کریم ﷺ کے سفر معراج کی پہلی منزل ہے، معراج کے موقع پر مکہ مکرمہ سے آپ مسجد اقصیٰ تشریف لے گئے پھر وہاں سے آپ کو آسمانوں کی سیر کرائی گئی، واپسی میں بھی آپ مسجد اقصیٰ تشریف لائے پھر وہاں سے مکہ مکرمہ واپس ہوئے، مکہ سے مسجد اقصیٰ تک کے سفر کو اسراء اور مسجد اقصیٰ سے

آسمانوں تک کے سفر کو معراج کہا جاتا ہے۔ اسی سفر میں مسلمانوں کو پانچ وقت کی نماز کا تحفہ ملا، اسی سفر سے واپسی پر نبی کریم ﷺ نے مسجد اقصیٰ کے پاس تمام انبیاء کرام علیہم الصلوٰۃ والسلام کی امامت فرمائی۔ مسجد اقصیٰ سے تعلق کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ یہ مسلمانوں کا قبلۂ اول رہا، ہجرت مدینہ طیبہ کے بعد سولہ یا سترہ مہینے تک رسول اللہ ﷺ نے مسجد اقصیٰ کی طرف رخ کر کے نماز ادا فرمائی، پھر تحویل قبلہ کا حکم آنے کے بعد خانۂ کعبہ کی طرف آپ نے رخ فرمایا جس کا تذکرہ دوسرے پارے کی ابتدائی آیات میں موجود ہے: سَيَقُولُ السُّفَهَاءُ مِنَ النَّاسِ مَا وَلَّاهُمْ عَنْ قِبْلَتِهِمُ الَّتِي كَانُوا عَلَيْهَا قُلْ لِلهِ الْمَشْرِقُ وَالْمَغْرِبُ يَهْدِيْ مَنْ يَشَاءُ إِلَى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيمٍ (البقرۃ:۱۴۲)

ترجمہ: بے وقوف لوگ کہیں گے کہ کس چیز نے مسلمانوں کو ان کے قبلہ سے پھیر دیا جس پر وہ تھے، کہہ دو مشرق اور مغرب اللہ ہی کا ہے، وہ جسے چاہتا ہے سیدھا راستہ دکھاتا ہے۔

اس میں "قِبْلَتِهِمُ الَّتِيْ كَانُوْا عَلَيْهَا" سے مراد مسجد اقصیٰ ہے۔

مسجد اقصیٰ اور سرزمین فلسطین متعدد انبیاء کرام علیہم الصلوٰۃ والسلام کی قیام گاہ اور ان کا مدفن رہ چکی ہے، اس مسجد کی پہلی تعمیر تو فرشتوں کے ذریعہ ہوئی، جب کہ دوسری تعمیر حضرت داؤد اور حضرت سلیمان علیہما السلام کے ذریعہ ہوئی ہے اس لیے مسلمانوں کا جو تعلق سرزمین فلسطین سے، وہاں کے باشندوں سے اور مسجد اقصیٰ سے ہے وہ انتہائی جذباتی قسم کا گہرا قلبی تعلق ہے، آج یورپ کی سازش کی بنا پر مین قلب عرب کے اندر جو اسرائیل کی شکل میں خنجر گھونپا گیا ہے اس کی ٹیس اس وقت سے لے کر آج تک پورا عالم اسلام محسوس کر رہا ہے؛ چونکہ یہ ایک سازشی عمل تھا اس لیے مسلسل ہر مغربی ملک کی جانب سے اس کی پشت پناہی کی جارہی ہے اور نام نہاد ملک اسرائیل اپنے توسیع پسندانہ عزائم کے ساتھ نہ صرف یہ کہ اپنے قدم آگے بڑھا رہا ہے؛ بلکہ فلسطین کے جو اصل باشندے ہیں ان پر ظلم وستم کے پہاڑ توڑ رہا ہے۔

اہل فلسطین کی جرعت وعزیمت کو سلام

ابھی دو ہفتوں کے اندر جو تازہ حادثات پیش آئے ہیں کہ فلسطین کے باشندوں پر ظلم ڈھایا گیا، انھیں مارا پیٹا گیا اور اس کے بعد ان کی طرف سے جو معمولی سی مزاحمت ہوئی اس کو بہانہ بنا کر غزہ کے علاقے میں بمباری کی گئی جس میں ہزاروں فلسطینی شہید اور زخمی ہوئے، بچے اور عورتیں ماری گئیں؛ لیکن شاباشی کے قابل ہیں وہ نہتے مجاہدین جنھوں نے اپنی بے سروسامانی کے باوجود بھرپور انداز میں

مزاحمت کی، ان شاء اللہ اسرائیل جیسے نومولود، متکبر اور سرکش ملک کو گھٹنے ٹیکنا پڑے گا اور وہ جنگ بندی کے لیے مجبور ہوگا۔

ہم کیا کریں؟

بہر حال اس وقت ہمارے کرنے کے کئی کام ہیں۔ پہلا کام تو یہ ہے کہ پوری دنیا کے مسلمان فلسطین کے نہتے مسلمانوں کے ساتھ اپنی ہم آہنگی اور تعاون کا اظہار کریں؛ تاکہ انھیں یہ محسوس ہو کہ اس مسئلہ میں ہم اکیلے نہیں ہیں؛ بل کہ پورا عالم اسلام ہمارے ساتھ ہے۔

آج کی دنیا رائے عامہ کی بنیاد پر فیصلہ کرنے کی عادی ہے؛ اس لیے تمام دنیا کے مسلمان اور خاص طور سے برصغیر اور خصوصاً ہندوستان کے مسلمان فلسطین اور اہل فلسطین کی حمایت میں اپنی آواز بلند کریں اور عالمی ضمیر کو جھنجھوڑنے کی کوشش کریں۔ وہ مغربی ممالک وہ UNO وہ سلامتی کونسل جو اپنے من مانے مقاصد کے لیے خود ساختہ مسائل کے لیے امن و آشتی کا ڈھنڈورا پیٹتے ہیں، جہاں چاہتے ہیں، وہاں کے لوگوں پر اپنے فیصلے مسلط کر دیتے ہیں، ان کی نگاہوں کے سامنے فلسطینی مسلمانوں اور وہاں کے باشندوں پر ظلم ہو رہا ہے؛ لیکن ان کے کانوں پر جوں تک نہیں رینگتی؛ اس لیے ضروری ہے کہ فلسطین اور باشندگان فلسطین کے حق میں اس زور وشور کے ساتھ آواز بلند کی جائے کہ سلامتی کونسل فلسطین کے مسئلے میں حق وانصاف کا فیصلہ کرنے پر مجبور ہوں، فلسطینیوں کو ان کا حق دلایا جائے، ان کی جو زمینیں چھین لی گئی ہیں، وہ انھیں واپس کی جائیں نیز اسرائیل اور اس کے آقاؤں کی طرف سے جو اقدامات ہو رہے ہیں ان پر بندش قائم کی جائے۔ اسی کے ساتھ ساتھ ہم سب کے سب مل کر بارگاہ الٰہی میں دعا بھی کریں کہ اللہ تعالیٰ قدس کے باشندوں کی حفاظت فرمائے، انھیں ان کا چھینا ہوا وقار واپس دلائے، مسجد اقصیٰ کو یہودیوں کے نرغے سے نکلنے کے اسباب پیدا فرمائے۔ آمین

قابل توجہ پہلو

اس موقع پر ایک بات خاص طور سے توجہ کے قابل ہے کہ بیت المقدس کے علاقے میں ایک تو قبۂ صخرہ ہے اور ایک مسجد اقصیٰ ہے۔ عام طور سے مسجد اقصیٰ کے نام پر جو تصویر دکھلائی جاتی ہے جس کا سنہرا گنبد ہے، وہ حقیقت میں مسجد اقصیٰ نہیں ہے؛ بلکہ وہ قبۂ صخرہ ہے مسجد اقصیٰ اس سے الگ عمارت

ہے اور اسرائیل اور صیہونی خاص طور سے مسلسل کوشش کر رہے ہیں کہ مسجد اقصیٰ کے ارد گرد کھدائی کر کے، اس عمارت کو کمزور کر دیں؛ تاکہ وہ عمارت منہدم ہو جائے یہ ایک سازش ہے کہ دنیا کے سامنے مسجد اقصیٰ کا اصلی نقشہ پیش کرنے کے بجائے قبۂ صخرہ کو مسجد اقصیٰ کے نام پر دکھلایا جاتا ہے تاکہ خدانخواستہ خدانخواستہ اگر کسی وقت یہ اسرائیلی اور صیہونی اپنی ناپاک مقصد کے اندر کامیاب ہو جائیں اور مسجد اقصیٰ کو نقصان پہونچا بیٹھیں تو اس وقت دنیا کے واویلا کرنے پر یہ قبۂ صخرہ کو سامنے لا کر دکھلا دیں کہ نہیں مسجد اقصیٰ محفوظ ہے؛ اس لیے ان دونوں کے فرق کو جاننا چاہیے اور مسجد اقصیٰ کی تاریخ سے لوگوں کو واقفیت کرانی چاہیے۔

مشکل یہ ہے کہ ہم اپنی تاریخ سے بھی واقف نہیں ہیں؛ اس لیے یہ بھی ایک ضرورت ہے کہ عالم اسلام کی عمومی تاریخ سے اور خاص کر وہ مقامات اور علاقے کہ جن سے اہم واقعات متعلق ہیں پوری ملت کو اور خاص طور سے آنے والی نئی نسلوں کو واقف کرایا جائے۔

اے اللہ! فلسطین کے مسلمانوں کی حفاظت فرما، مسجد اقصیٰ کی حفاظت فرما، ظالموں کو ان سے ظلم سے روک دے، انھیں کیفر کردار تک پہنچا، مظلوموں کی حمایت فرما، پورے عالم اسلام کے مسلمانوں کے ضمیروں کو بیدار فرما اور اپنی ذمہ داریوں کو سمجھنے کی انھیں توفیق عطا فرما۔ آمین!

❊ ❊ ❊

مسجدِ اقصیٰ کی فضیلت واہمیت

از: مولانا ابوبکر حنفی شیخوپوری

مسجدِ اقصیٰ تینوں آسمانی مذاہب، یہودیت، عیسائیت اور اسلام کے ماننے والوں کے ہاں بہت زیادہ اہمیت وعظمت رکھتی ہے۔ اسلام میں اسے حرم کا درجہ حاصل ہے، اس کا شمار مقدس مقامات میں ہوتا ہے، آیاتِ قرآنیہ، احادیثِ نبویہ اور تاریخ کی معتبر روایات کی روشنی میں اس کے فضائل، مسائل، تاریخی خدوخال اور جغرافیہ وغیرہ کے اعتبار سے جو معلومات حاصل ہوتی ہیں ان کا خلاصہ قارئین کی خدمت میں پیش کیا جارہا ہے۔

مسجد کے اسماء اور وجوہِ تسمیہ

اس عظمت وحرمت والے مقام کو ''مسجدِ اقصیٰ'' اور ''بیت المقدس'' کہا جاتا ہے، مسجدِ اقصیٰ کہنے کی وجہ یہ ہے کہ اقصیٰ کے معنی دوری کے آتے ہیں اور یہ مسجد بھی مسجدِ حرام سے بہت زیادہ فاصلے پر ہے اور بیت المقدس کی وجہ تسمیہ کے بارے میں تفسیر جمل میں نقل کیا گیا ہے کہ مقدس کا معنی ہے پاکیزہ اور مطہر چیز اور اس مسجد کو بھی اللہ نے غیر اللہ کی عبادت سے پاک کیا ہے، اس میں بتوں اور مجسموں کی عبادت نہیں کی جاتی۔ یہاں کے مقامی باشندے اسے ''حرمِ قدسی شریف'' کے نام سے بھی یاد کرتے ہیں۔

محلِ وقوع

مسجدِ اقصیٰ ملکِ فلسطین میں واقع ہے اور فلسطین کے جس شہر میں ہے وہ دو حصوں میں منقسم ہے، ایک جدید شہر ہے اور ایک قدیم۔ قدیم شہر کو ''یروشلم'' بھی کہتے ہیں اور ''القدس'' بھی، مسجدِ اقصیٰ اور دیگر مقدس مقامات مثلاً انبیاء کی یادگاریں، حجرے اور گذشتہ قوموں کے آثار اسی قدیم شہر میں

موجود ہیں،اس قدیم شہر کا چاروں طرف سے سولہ سو میٹر لمبی پتھر کی دیوار کے ساتھ احاطہ کیا گیا ہے جس میں نو بڑے بڑے دروازے ہیں۔

سرزمینِ شام کی فضیلت

شام ایک بہت بڑا ملک تھا اور قدیم جغرافیائی تقسیم کے مطابق فلسطین الگ ملک کی حیثیت سے خطہ ارض پر موجود نہیں تھا؛ بلکہ ملکِ شام ہی کا ایک حصہ تھا، فلسطین کے علاوہ اردن، لبنان، مقبوضہ فلسطین (موجودہ اسرائیل) بھی شام کی حدود میں پڑتے تھے، اللہ تعالی نے جس طرح مسجدِ اقصی کو عظمتوں اور برکتوں سے نوازا اسی طرح سرزمینِ شام جس میں مسجدِ اقصی واقع ہے اس کو بھی بڑا مقام ومرتبہ عطا کیا ہے، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے لیے برکت کی دعا فرمائی ہے، چنانچہ صحیح بخاری میں حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما روایت کرتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اے اللہ! ہمارے لیے ہمارے شام اور ہمارے یمن میں میں برکت عطا فرما (صحیح بخاری)۔اس حدیث میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ''شامنا'' یعنی ہمارا شام کہہ کر اس کی نسبت اپنی طرف فرمائی ہے جس سے اس کی عظمت دوچند ہوگئی ہے۔حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک موقع پر فرمایا: ملکِ شام کے لیے مبارک ہو، ہم نے عرض کیا: یارسول اللہ! کس وجہ سے؟ ارشاد فرمایا: رحمٰن کے فرشتے اس کے اوپر پر پھیلائے ہوئے ہیں (ترمذی) حضرت ابودرداء رضی اللہ عنہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد نقل کرتے ہیں: یاد رکھو! جب فتنے آئیں گے تو ایمان ملکِ شام میں ہوگا (مجمع الزوائد)

مسجدِ اقصی کی فضیلت

مسجدِ اقصی روئے زمین پر موجود مقدس مقامات میں سے ایک اہم ترین مقام ہے، جہاں ہزاروں سال بعد بھی نمازِ پنج گانہ، جمعہ، عیدین، اعتکاف، درس وتدریس اور تمام عبادات کا سلسلہ جاری ہے، اس کی روحانی، وجدانی اور نورانی فضاؤں میں آج بھی مسلمان کچھ لمحات گزارا اپنے اپنی تسکینِ قلبی کا سامان کرتے ہیں۔مسجدِ اقصی کی فضیلت کے بہت سے پہلو ہیں جن سے اس کی تقدیس عیاں ہوتی ہے، چند ایک پہلو ذیل کی سطور میں درج کیے جاتے ہیں۔

۱-خاص ثواب کی نیت سے سفر

مسجدِ اقصی کی زیارت کی نیت سے سفر کرنا شریعت میں مندوب اور مطلوب ہے۔حضرت

ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: (خاص ثواب کی نیت سے) صرف تین مسجدوں کی طرف رختِ سفر باندھا جاسکتا ہے، وہ مسجدِ حرام، میری مسجد (مسجدِ نبوی) اور مسجدِ اقصی ہے (صحیح مسلم) یعنی نماز کے ثواب کے اعتبار سے تمام مساجد برابر ہیں، کسی مسجد کو کسی پر کوئی ترجیح نہیں، لہٰذا کسی مسجد کی طرف خصوصی ثواب کا اعتقاد رکھ کر سفر کرنا جائز نہیں؛ البتہ یہ تین مساجد اس حکم سے مستثنیٰ ہیں۔

۲-دنیا کی دوسری مسجد

مسجدِ اقصی کو یہ خصوصی اعزاز بھی حاصل ہے کہ مسجدِ حرام کے بعد تعمیر کے اعتبار سے خطہ ارض پر یہ دوسری مسجد ہے، حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نے عرض کیا: یارسول اللہ! زمین پر سب سے پہلے کون سی مسجد تعمیر کی گئی؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: مسجدِ حرام، میں نے پھر سوال کیا: اس کے بعد کون سی مسجد تعمیر کی گئی؟ ارشاد فرمایا: مسجدِ اقصی، میں نے عرض کیا: ان دونوں میں کتنا (زمانی) فاصلہ ہے؟ ارشاد فرمایا: چالیس سال (سنن نسائی)۔

۳-نماز کے ثواب میں اضافہ

مسجدِ اقصی میں نماز پڑھنے کا ثواب عام مسجدوں سے زیادہ ہے، حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: میری مسجد (مسجدِ نبوی) میں ایک نماز پڑھنے کا ثواب مسجد اقصی کی چار نمازوں سے زیادہ ہے اور وہ بہت اچھی نماز کی جگہ ہے، عنقریب ایسا زمانہ آئے گا کہ اگر لوگوں کو گھوڑے کی ایک لگام کے برابر بھی جگہ مل جائے جس سے وہ مسجدِ اقصی کی زیارت کرسکیں تو وہ اس زیارت کو ساری دنیا سے بہتر سمجھیں گے۔ (مستدرکِ حاکم) ایک حدیث میں ہے کہ مسجدِ اقصی میں ایک نماز کا ثواب ایک ہزار نمازوں کے برابر ہے۔

۴-مقامِ حشر

مسجدِ اقصی جس جگہ واقع ہے، اس جگہ قیامت کے دن تمام لوگوں کو جمع کر کے ان کے اعمال کا حساب لیا جائے گا۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی زوجہ محترمہ حضرت میمونہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ میں نے عرض کیا: یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! ہمیں بیت المقدس کے بارے میں آگاہ کیجیے! آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: وہ سرزمین (جہاں بیت المقدس ہے) حشر کی جگہ ہے (ابنِ ماجہ)

۵-سفرِ معراج کی ایک منزل

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے شبِ معراج آسمانی سفر سے پہلے بذریعۂ براق زمینی سفر فرمایا، اس

سفر کی ابتداء بیت اللہ سے فرمائی اور راستے میں کئی جگہ پڑاؤ کیا، آخری پڑاؤ بیت المقدس میں فرمایا، اس کے بعد زمین سے آسمان کی طرف سفر شروع فرمادیا، حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: میرے پاس براق لایا گیا، یہ ایک سفید رنگ کی لمبی سواری تھی، گدھے سے کچھ بڑی اور خچر سے کچھ چھوٹی تھی، جہاں نگاہ پڑتی تھی وہاں اس کے قدم پڑتے تھے، میں اس پر سوار ہوا یہاں تک کہ بیت المقدس پہنچ گیا، وہاں پہنچ کر سواری کو اس حلقے سے باندھ دیا جس حلقے سے دوسرے انبیاء باندھا کرتے تھے، پھر میں نے مسجد میں داخل ہوکر دو رکعات ادا کیں اور باہر نکل آیا، جبرائیل میرے پاس دو برتن لائے، ایک میں دودھ اور ایک میں شراب تھی، میں نے اس میں سے دودھ والا برتن لے لیا، جبرائیل نے کہا: آپ نے فطرت کو پسند فرمایا، اس کے بعد وہ مجھے آسمان کی طرف لے گئے (صحیح مسلم)

۶-مسلمانوں کا قبلۂ اول

نماز میں جب تک بیت اللہ کی طرف منہ کرنے کا حکم نہیں آیا تھا تب تک مسلمان بیت المقدس کی طرف منہ کرکے نماز پڑھتے تھے، حضرت براء بن عازب رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: ہم نے سولہ یا سترہ مہینے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ بیت المقدس کی طرف منی کرکے نمازیں پڑھیں، پھر کعبۃ اللہ کو ہمارے لیے قبلہ مقرر کردیا گیا (صحیح بخاری)

۷-انبیاء اور اولیاء کا مسکن

مسجدِ اقصیٰ کو ہزاروں نبیوں اور اولیاء اللہ کی قدم بوسی کا شرف حاصل ہے، خدا کے نیک بندے اپنی روحانی تسکین کے لیے یہاں وقت گذارا کرتے تھے، بہت سے انبیاء کو اسی مسجد میں منصبِ نبوت سے نوازا گیا، حضرت مریم علیہا السلام کے والد حضرت عمران اسی مسجد کی امامت وخطابت اور تولیت کے فرائض سرانجام دیتے رہے، ان کے بعد یہ ذمہ داری حضرت زکریا علیہ السلام نے اٹھائی، حضرت مریم کی پیدائش کے اول روز سے ہی ان کی والدہ حضرت حنہ انھیں مسجد اقصیٰ کے منتظمین کے حوالہ کرآئیں، جہاں حضرت زکریا علیہ السلام نے ان کی پرورش کی جو رشتے میں ان کے خالو لگتے تھے۔ یہیں بیت المقدس کے حجرے میں حضرت زکریا علیہ السلام نے بڑھاپے میں اللہ تعالیٰ سے بیٹے کا سوال کیا، اللہ تعالیٰ نے انہیں حضرت یحییٰ علیہ السلام کی خوشخبری دی، تمام انبیاء کرام معراج کی شب یہاں تشریف لائے جہاں رسول اللہ ﷺ نے ان کی امامت فرمائی، حضرت ابراہیم علیہ السلام اور ان کے چچازاد بھائی حضرت لوط علیہ السلام اور ان کی زوجہ حضرت سارہ علیہا السلام نے عراق کے شہر

بابل سے یہیں ہجرت فرمائی۔اسی بناء پر مسجدِ اقصی کو سرزمین انبیاء کہا جاتا ہے۔

۸-دجال سے حفاظت

مسجدِ اقصی کے تقدس کے پیشِ نظر اس میں دجال کو داخلے کی اجازت نہ ہوگی اور وہ اپنے ناپاک قدموں سے اس پاک گھر کو آلودہ نہیں کرسکے گا، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: دجال زمین میں پھرے گا،مگر چار مسجدوں تک نہ جاسکے گا، وہ مسجدِ حرام،مسجدِ نبوی،مسجدِ طور اور مسجدِ اقصی ہیں(طبرانی)

۹-انبیاء کے ہاتھوں تعمیر

مسجدِ اقصی کی تعمیر کا عمل انبیاء کرام کے مبارک ہاتھوں سرانجام پایا،بعض اہلِ علم نے حضرت آدم علیہ السلام کو اور بعض نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو اس مسجد کا بانی قرار دیا ہے؛لیکن سب سے درست اور قرینِ قیاس قول یہ ہے کہ اسے حضرت سلیمان علیہ السلام نے جنات کی مدد سے تعمیر کروایا ہے؛جب کہ اس کی تعمیر کی تجویز حضرت سلیمان علیہ السلام کے والدِ بزگوار حضرت داؤد علیہ السلام نے دی اور ان کی بزرگی اور شرافت کی وجہ سے انھیں سے حضرت سلیمان علیہ السلام نے سنگِ بنیاد رکھوایا،حدیث میں ہے: حضرت داؤد علیہ السلام بیت المقدس کی بنیادیں پتھروں سے بھر رہے تھے پھر اللہ تعالی نے کی طرف وحی کی کہ میں مسجدِ اقصی کی تعمیر حضرت سلیمان علیہ السلام کے ہاتھوں مکمل کرواؤں گا(مستدرکِ حاکم)

❊ ❊ ❊

اسرائیل کے قیام اور بقا کی جدوجہد

از: مولانا زاہدالراشدی

یروشلم اس شہرِ مقدس کا عبرانی نام ہے جسے ہم ''القدس'' یا ''بیت المقدس'' کے نام سے یاد کرتے ہیں۔ بعض روایات کے مطابق مکہ مکرمہ میں خانہ کعبہ کی تعمیر کے چالیس سال بعد حضرت یعقوب علیہ السلام نے فلسطین میں بیت المقدس تعمیر کیا تھا اور تب سے وہاں آبادی کا سلسلہ شروع ہوگیا تھا۔ اس دور میں مکہ مکرمہ بنی اسماعیل کا اور بیت المقدس بنی اسرائیل کا قبلہ قرار پایا تھا اور دونوں میں روحانی برکات اور رونقوں کا سلسلہ تب سے چلا آ رہا ہے۔

حضرت یوسف علیہ السلام کے مصر کا حاکم بننے کے بعد حضرت یعقوب علیہ السلام اور ان کے خاندان نے مصر کو اپنا مسکن بنایا تو اس کے بعد بیت المقدس پر دوسری قوموں کا قبضہ ہوگیا۔ پھر حضرت موسیٰ علیہ السلام کے زمانے میں بنی اسرائیل کو مصر میں فرعون کی غلامی سے نجات ملی اور وہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی قیادت میں بحیرۂ قلزم پار کر کے وادی سینا میں پہنچے تو انھیں حکم دیا گیا کہ وہ جہاد کر کے بیت المقدس کو آزاد کرائیں اور اپنے پرانے شہر میں جا کر آباد ہوں؛ مگر بنی اسرائیل نے جہاد کرنے سے انکار کر دیا، جس کی سزا انھیں قرآن کریم کے ارشاد کے مطابق یہ ملی کہ چالیس سال تک ان کا داخلہ بیت المقدس میں حرام کر دیا گیا۔ اسی دوران حضرت موسیٰ علیہ السلام اور حضرت ہارون علیہ السلام کا انتقال ہوگیا اور چالیس سال کا عرصہ گزر جانے کے بعد حضرت یوشع بن نون علیہ السلام کی قیادت میں بنی اسرائیل نے جہاد کے ذریعہ بیت المقدس کو آزاد کرایا۔

پھر ایک عرصہ گزرنے کے بعد بیت المقدس کا علاقہ دوسری قوموں کے قبضے میں چلا گیا تو حضرت طالوتؒ کی قیادت میں بنی اسرائیل نے جہاد کر کے وقت کے جابر جالوت کو شکست دی اور یہ علاقہ آزاد کرایا۔ ان دونوں جنگوں کا تذکرہ قرآن کریم میں موجود ہے۔

حضرت داؤد علیہ السلام نے حضرت طالوتؒ کے جانشین کی حیثیت سے اس نئی مملکت کی حکومت سنبھالی جسے اسرائیل کا نام دیا گیا اور یہ سلطنت حضرت سلیمان علیہ السلام کے دور میں اپنے عروج تک پہنچی۔ آج کے یہود حضرت سلیمان علیہ السلام کے دور کی اس وسیع سلطنت کو اپنا ہدف اور حق قرار دیتے ہوئے اس کی سرحدوں تک موجود اسرائیل کو وسیع کرنے کا دعویٰ رکھتے ہیں۔

حضرت سلیمان علیہ السلام نے اس شہر میں ''ہیکل سلیمانی'' تعمیر کی جو بنی اسرائیل کا قبلہ بنا اور وہ دور اس مقدس شہر کے عروج اور کمال کا دور تھا۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی ولادت سے پانچ صدیاں قبل بابل کے حکمران بخت نصر نے حملہ کر کے اس مقدس شہر کو تاراج کر دیا، ہیکل سلیمانی کو جلا کر راکھ کر دیا، لاکھوں یہودیوں کو قتل کر دیا، پورے شہر کو ملیامیٹ کر دیا اور باقی ماندہ یہودیوں کو جو لاکھوں کی تعداد میں بتائے جاتے ہیں اپنے ساتھ قیدی بنا کر بابل لے گیا۔

ایک عرصہ ویران رہنے کے بعد بیت المقدس دوبارہ آباد ہوا اور ہیکل سلیمانی کی تعمیر پھر سے کی گئی، اس کے بعد اس شہر کے ایک بزرگ خاندان ''آل عمران'' میں اللہ تعالیٰ نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو اپنی قدرت کاملہ سے بغیر باپ کے پیدا کیا اور ان پر انجیل اتاری۔ یہ دور حضرت زکریا علیہ السلام اور حضرت یحییٰ علیہ السلام کا دور ہے جب بیت المقدس کی تولیت ان بزرگوں کے پاس تھی؛ مگر اس پر رومی حکمرانوں کا اقتدار قائم تھا۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے خلاف سازش کر کے یہودیوں نے انہیں رومی حکومت کے ہاتھوں پھانسی دلوانا چاہی؛ مگر اللہ تعالیٰ نے انھیں زندہ آسمان پر اٹھالیا۔ ان کے رفع آسمانی کے کچھ عرصہ بعد جب رومیوں نے عیسائیت قبول کر لی تو طیطس رومی نامی مسیحی حاکم نے بیت المقدس پر حملہ کر کے وہاں سے یہودیوں کو نکال دیا، ہیکل سلیمانی کو جلا کر راکھ کر دیا اور یہودیوں کے وہاں رہنے پر پابندی لگا دی۔ طیطس رومی کے اس حملہ اور یروشلم سے یہودیوں کے اخراج کے بعد یہ مقدس شہر ان کے ہاتھ سے نکل کر عیسائیوں کے قبضے میں چلا گیا اور دو ہزار سال سے زائد عرصہ تک انھیں دوبارہ اس شہر میں رہنا نصیب نہیں ہوا۔

امیر المؤمنین حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے دورِ خلافت میں ''بیت المقدس'' مسلمانوں کی تحویل میں آیا اور حضرت عمرؓ نے خود وہاں تشریف لے جا کر اس کو سنبھالا۔ اس سے قبل جناب سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم معراج کے سفر میں وہاں تشریف لا کر حضرات انبیاء کرام علیہم السلام کی امامت فرما چکے تھے اور ہجرت مدینہ کے بعد مسلمان کم وبیش سترہ ماہ بیت المقدس کی طرف رُخ کر کے نماز پڑھتے رہے تھے، جس کی وجہ سے بیت المقدس مسلمانوں کا قبلۂ اول کہلاتا ہے اور ان دو حیثیتوں

سے مسلمانوں کی عقیدت ومحبت اس شہر سے وابستہ چلی آ رہی ہے۔

تاریخی روایات کے مطابق حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اُس مقام پر جو صخرہ کہلاتا ہے، جہاں معراج کی رات حضرت نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی سواری باندھی گئی تھی، نماز ادا کی اور مسجد بنانے کی ہدایت دی۔ اسی پر وہ تاریخی قبہ ہے جو ''قبۃ الصخرۃ'' کے نام سے معروف ہے، خلیفہ عبدالملک بن مروانؒ کے زمانے میں وہاں مسجد تعمیر کی گئی۔

بیت المقدس پر اس وقت اپنے تاریخی پس منظر کے حوالہ سے تین قوموں کا دعویٰ ہے۔ مسلمانوں کا اس وجہ سے کہ وہ ان کا قبلۂ اول ہے، سفر معراج میں جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا مقام امامت ہے اور کم وبیش بارہ سو سال ان کی تحویل اور تولیت میں رہا ہے۔ یہودیوں کا اس حوالہ سے کہ ان کے بقول وہاں ان کا وہ ہیکل سلیمانی ہے جو طیطس رومی نے ویران کر دیا تھا، وہ ان کا قبلہ ہے اور یہودی اسے دوبارہ تعمیر کرنے کا زعم رکھتے ہیں؛ جبکہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی جائے ولادت ہونے کے باعث ''بیت اللحم'' عیسائیوں کا قبلہ اور متبرک مقام ہے جو بیت المقدس سے تقریباً پانچ میل کے فاصلے پر ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ مرزا بہاء اللہ شیرازی کے پیروکار بہائیوں کا قبلہ بھی فلسطین میں ہے جو عکّہ کہلاتا ہے اور فلسطین کا مشہور شہر ہے۔

چونکہ بیت المقدس کو عیسائیوں سے مسلمانوں نے حاصل کیا تھا اس لیے اس کے قبضہ وکنٹرول کے بارے میں مسلمانوں اور عیسائیوں کے درمیان شدید مخاصمت رہی ہے۔ صلیبی جنگوں کے دوران یورپ کی متحدہ فوجوں نے گیارہویں صدی عیسوی کے آخر میں بیت المقدس پر قبضہ کر لیا تھا جو کم وبیش نوے سال رہا اور سلطان صلاح الدین ایوبیؒ نے مسلسل معرکوں کے بعد اسے عیسائیوں کے قبضے سے آزاد کرایا۔ بیت المقدس فلسطین کا دارالحکومت تھا جو درمیان کے مذکورہ نوے برس کے عرصہ کے علاوہ حضرت عمرؓ کے دور سے مسلمانوں کے پاس ہی رہا ہے، حتیٰ کہ پہلی جنگ عظیم کے بعد برطانیہ نے دسمبر ۱۹۱۷ء میں اس پر قبضہ کر کے اس پر اپنا اقتدار قائم کر لیا۔

اس سے قبل فلسطین خلافت عثمانیہ کا صوبہ تھا، پہلی جنگ عظیم میں خلافت عثمانیہ نے جرمنی کا ساتھ دیا تھا اس لیے جرمنی کی شکست کے ساتھ ہی خلافت عثمانیہ بھی شکست وریخت کا شکار ہو گئی تھی اور اس بندر بانٹ میں فلسطین پر برطانیہ کا قبضہ عالمی سطح پر تسلیم کر لیا گیا تھا۔ ''گاڈفرے ڈی بولون'' نامی انگریز کمشنر نے ۱۰؍دسمبر ۱۹۱۷ء کو فلسطین کا اقتدار سنبھالا اور ۱۵؍مئی ۱۹۴۸ء تک فلسطین پر برطانیہ کا قبضہ رہا۔ خلافت عثمانیہ نے یہودیوں کو ویزے پر بیت المقدس آنے اور اپنے مقدس

مقامات کی زیارت اور وہاں عبادت کی آزادی دے رکھی تھی مگر انھیں فلسطین میں زمین خریدنے، کاروبار کرنے اور رہائش اختیار کرنے کا حق قانونی طور پر حاصل نہیں تھا۔

اس دوران یہودیوں نے عالمی سطح پر ''صہیونیت'' کے عنوان سے ایک تحریک کا آغاز کیا۔ صہیون بیت المقدس کا ایک پہاڑ ہے جو یہودیوں کے ہاں بہت متبرک سمجھا جاتا ہے اور بتایا جاتا ہے کہ اس پہاڑی پر حضرت داؤد علیہ السلام کی عبادت گاہ تھی۔ اس پہاڑ کے تقدس کو عنوان بنا کر یہودیوں نے تحریک شروع کی جس میں فلسطین کو یہودیوں کا قومی وطن قرار دے کر اسے واپس لینے کا عزم کیا گیا تھا۔ صہیونی تحریکوں کے لیڈروں نے اس وقت کے عثمانی خلیفہ سلطان عبدالحمید دوم مرحوم سے درخواست کی کہ یہودیوں کو فلسطین میں آباد ہونے کا حق دیا جائے۔ سلطان نے اس سے انکار کر دیا، انھیں بیش بہا مالی مراعات کی پیش کش کی جو انھوں نے قبول نہیں کیں۔ سلطان عبدالحمید دوم نے اپنی یادداشتوں میں لکھا ہے کہ انہیں معلوم تھا کہ یہودی صرف فلسطین میں آباد ہونے کا حق نہیں مانگ رہے؛ بلکہ اس کی آڑ میں بیت المقدس پر قبضہ کرنے کا پروگرام رکھتے ہیں؛ اس لیے ان کی ملّی غیرت نے گوارا نہیں کیا کہ وہ یہودیوں کو اس بات کا موقع فراہم کریں۔ اس وجہ سے سلطان عبدالحمید دوم یہودیوں کے غیظ وغضب کا نشانہ بنے اور ان کے خلاف وہ تحریک چلی جس کے نتیجے میں وہ خلافت سے محروم ہو کر نظر بندی کی زندگی بسر کرنے پر مجبور ہو گئے اور اسی نظر بندی میں ان کا انتقال ہوا۔

اس موقع پر برطانیہ کے وزیر خارجہ بالفور نے اعلان کیا کہ وہ فلسطین کو یہودیوں کا قومی وطن تسلیم کرتے ہیں اور موقع ملنے پر انہیں وہاں آباد ہونے کی سہولت فراہم کرنے کا وعدہ کرتے ہیں۔ اسے اعلان بالفور کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ اس کے عوض یہودیوں نے پہلی جنگ عظیم کے دوران برطانیہ کے مالی نقصانات کی تلافی کرنے کا وعدہ تھا اور ان مالی مفادات کے باعث برطانیہ اور اس کے ساتھی ممالک نے فلسطین کو یہودیوں کا قومی وطن تسلیم کرنے کا اعلان کیا تھا۔

چنانچہ جب فلسطین برطانیہ کے قبضے میں گیا تو وہ قانون منسوخ کر دیا گیا جس کے تحت یہودیوں کو فلسطین میں زمین خریدنے اور سکونت اختیار کرنے سے روکا گیا تھا۔ اس کے بعد دنیا بھر سے یہود وہاں آنا شروع ہو گئے اور فلسطین میں زمینیں اور مکانات خرید کر آباد ہونے کا آغاز کر دیا۔

اس موقع پر مفتی اعظم فلسطین الحاج سید امین الحسینیؒ نے فتویٰ جاری کیا کہ چونکہ یہودی بیت المقدس میں آباد ہو کر بیت المقدس پر قبضہ کرنا چاہتے ہیں اس لیے فلسطین کی زمین یہودیوں پر فروخت کرنا شرعاً جائز نہیں۔ برصغیر کے اکابر علماء کرام نے بھی جن میں حکیم الامت حضرت مولانا

اشرف علی تھانویؒ اور مفتی اعظم ہند حضرت مولانا مفتی کفایت اللہ دہلویؒ شامل ہیں اس فتویٰ کی تائید کی؛ مگر اس فتویٰ کے باوجود فلسطین میں یہودیوں پر زمینوں اور مکانات کی فروخت نہیں رکی۔ صرف اتنا ہوا کہ زمینوں کی قیمتیں بڑھ گئیں اور یہودیوں نے جو دنیا کے مختلف ممالک سے وہاں مسلسل آرہے تھے دُگنی چوگنی قیمتوں پر فلسطین کا ایک بڑا حصہ خرید لیا۔

۱۹۱۸ء سے ۱۹۴۸ء تک برطانیہ نے فلسطین میں یہودیوں کی آمد اور آبادی کی سرپرستی کرکے ''اعلان بالفور'' کے ذریعہ کیا گیا وعدہ پورا کیا اور جب دیکھا کہ فلسطین کا ایک بڑا حصہ یہودی خرید چکے ہیں تو ۱۵؍مئی ۱۹۴۸ء کو فلسطین کا علاقہ یہودیوں اور فلسطینیوں کے درمیان تقسیم کرنے کا اعلان کرکے برطانیہ وہاں سے چلا گیا۔ اس کے بعد فلسطینیوں اور یہودیوں کے درمیان جنگوں اور جھڑپوں کا وسیع سلسلہ چل نکلا۔ یہودیوں نے اپنے لیے برطانیہ کی طرف سے مخصوص کردہ علاقے میں اسرائیل کے نام سے نئی سلطنت قائم کرنے کا اعلان کردیا جسے امریکہ اور روس سمیت عالمی طاقتوں نے تسلیم کرلیا اور اقوام متحدہ نے بھی اسرائیل اور فلسطین کے درمیان حد بندی کرکے اسرائیل کو ایک آزاد ریاست قرار دینے کا اعلان کردیا۔

اس کشمکش میں یہودیوں نے اچھے خاصے علاقے پر قبضہ کیا مگر بیت المقدس کا مشرقی حصہ جس میں بیت المقدس کا مقدس احاطہ ہے، اردن کے پاس رہا اور اس پر اس کا انتظامی حق تسلیم کرلیا گیا۔ ۱۹۶۷ء کی عرب اسرائیل جنگ میں اسرائیل نے (مصر، شام اور اردن کے دیگر علاقوں کے ساتھ) یروشلم کے مشرقی حصے اور مسجد اقصیٰ پر بھی قبضہ کرلیا اور اس وقت سے یہ علاقہ اسرائیل کے قبضے میں ہے۔

اس کے بعد سے فلسطین اور بیت المقدس کے بارے میں عالمی سطح پر مسلمانوں کے دو موقف پائے جاتے ہیں۔ ایک موقف پاکستان، سعودی عرب اور بعض دیگر ممالک کا ہے کہ وہ سرے سے فلسطین کی تقسیم کو ہی تسلیم نہیں کرتے اور نہ ہی اسرائیل کو ایک قانونی ریاست کا درجہ دیتے ہیں۔ ان کے نزدیک فلسطین ایک اکائی ہے اور اس پر صرف فلسطینیوں کا حق ہے۔ دوسرا موقف مصر، شام اور اسرائیل کو تسلیم کرلینے والے بعض ممالک کا ہے کہ وہ اسرائیل کو اقوام متحدہ کی تقسیم اور فیصلے کے مطابق ایک آزاد ریاست تسلیم کرتے ہیں؛ لیکن ان کا مطالبہ ہے کہ اسرائیل اقوام متحدہ کے طے کردہ نقشے کے مطابق ۱۹۶۷ء کی جنگ سے پہلے کی سرحدوں کی طرف واپس جائے، بیت المقدس کا قبضہ چھوڑ دے اور فلسطینیوں کی ان کے علاقے میں آزاد ریاست کو تسلیم کرے۔

اسرائیل نے اس دوران مسلسل کوشش کی ہے کہ بیت المقدس پر اس کے قبضے کو جائز تسلیم کیا جائے اور یروشلم کو غیر متنازعہ شہر قرار دے کر اسرائیل میں شامل قرار دیا جائے؛ لیکن عالمی رائے عامہ اس کے اس موقف کو قبول نہیں کر رہی۔ ۱۹۹۵ء میں جب اسرائیل نے یروشلم کو اپنا دارالحکومت قرار دیا تو اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی نے ۵؍دسمبر ۱۹۹۵ء کو بھاری اکثریت کے ساتھ قرارداد منظور کر کے اسرائیل کے اس اقدام کو غیر قانونی قرار دے دیا اور واضح طور پر کہا کہ یروشلم کی حیثیت ایک متنازعہ شہر کی ہے اور باقاعدہ فیصلہ ہونے تک یہ متنازعہ شہر ہی رہے گا۔

اسی سلسلہ میں سابق امریکی صدر بُش کے دورِ حکومت میں ایک قانون جاری کیا گیا کہ یروشلم میں پیدا ہونے والے امریکی شہری کی جائے پیدائش اس کے پاسپورٹ میں یروشلم لکھی جاسکتی ہے جس کا مطلب یہ بنتا ہے کہ امریکہ کے نزدیک یروشلم متنازعہ شہر نہیں ہے؛ لیکن خود امریکہ کی وفاقی اپیل کورٹ نے اس قانون کو مسترد کر دیا ہے اور یروشلم کی متنازعہ حیثیت برقرار رکھنے کے حق میں فیصلہ دیا ہے۔

اس پس منظر میں امریکہ کی وفاقی اپیل کورٹ کا یہ فیصلہ خوش آئند ہے جس کا خیر مقدم کیا جانا چاہیے؛ لیکن صرف اتنا کافی نہیں ہے؛ بلکہ فلسطینیوں کو جو دنیا بھر میں لاکھوں کی تعداد میں پناہ گزین ہیں اور مہاجر ہیں، ان کا وطن واپس دلانے اور بیت المقدس کو اسرائیل کے ناجائز تسلط سے آزاد کرانے کے لیے اسلامی تعاون تنظیم (او آئی سی) کو سنجیدگی کے ساتھ کوئی ٹھوس لائحہ عمل اختیار کرنا چاہیے کہ ہمارا ملی فریضہ بہرحال یہی بنتا ہے۔

* * *

غزہ پر مظالم اور ہماری ذمہ داریاں

از: مولانا خالد سیف اللہ رحمانی

اگر پہاڑوں کو جگر ہوتا تو بعید نہ تھا کہ وہ بھی شق ہو جاتا، اگر درختوں کو آنکھیں ہوتیں، تو عجب نہ تھا کہ وہ بھی آنسوؤں کا دریا بہا دیتے، اگر زمین کو زبان ہوتی تو کیا عجب کہ اس کے نالہ وفریاد سے کرۂ ارض میں کہرام برپا ہو جاتا اور اگر درندے ان انسان نما درندوں کو دیکھ لیتے تو شاید وہ بھی شرمسار ہو جاتے اور درندگی میں صہیونیوں اور ان کی موافقت کرنے والوں کی بالادستی کے سامنے ہتھیار ڈال دیتے، اس خون آشامی، ظلم و بربریت، قتل وغارت گری کی وجہ سے جو اس وقت ''غزہ'' میں جاری ہے، جس کو سالہا سال سے اسرائیل کے ساتھ ساتھ اس کے نام نہاد، بے حمیت، کوتاہ ہمت ضمیر فروش اور منافق نام نہاد مسلم حکومتوں نے ایک ایسے قید خانہ میں تبدیل کر رکھا ہے، جو بنیادی ضروریات سے بھی محروم ہے۔

سلامتی ہو غزہ کے ان مجاہدین پر، جنھوں نے اپنے لہو سے اسلام کے شجر طوبیٰ کو سینچنے کا عزم کر رکھا ہے، صد ہزار رحمتیں ہوں ان شہداء راہِ حق پر، جنھوں نے اپنے خون کا ایک ایک قطرہ دین حق کی سرخروئی کے لیے نچھاور کر دیا ہے، لاکھوں سلام شوق پہنچے ان معصوم نونہالوں پر جنھوں نے اسلام کی سربلندی کے لیے اپنی معصوم جانوں کا نذرانہ پیش کر دیا ہے اور اسی قدر لعنتیں ان صلیبی اور صہیونی ظالموں پر جو دین و اخلاق اور بین الاقوامی قوانین کی دھجیاں بکھیر کر اپنی خون آشامی کی خو پوری کر رہے ہیں اور ان خوفِ خدا سے عاری اور ہمت مردانہ سے خالی مسلم حکمرانوں پر جن کے سینوں میں شیطان نے ''دل'' کی بجائے پتھر کی سِل رکھ دی ہے، جن میں سے بعض علی الاعلان یا خفیہ طور پر اسرائیل کے ہم نوا ہیں اور بدترین قسم کی برادر کشی کے مرتکب ہو رہے ہیں۔ بارِالٰہا! اپنے ان مظلوم بندوں پر رحم فرما، جن سے مغرب و مشرق کی عداوت صرف اس لیے ہے کہ وہ تیرے پاک نام سے

نسبت رکھتے ہیں اور پروردگارا! ہلاک وبرباد فرما، ان شقی وبدبخت حکومتوں کو، جو بے قصور انسانوں کے خون میں ڈوبی ہوئی ہیں، یا اس میں مددگار ہیں!!

سوال یہ ہے کہ جو مسلمان اپنے ان مظلوم اور نہتے بھائیوں کی اخلاقی مدد کرنے کے سوا کچھ اور نہیں کرسکتے، انھیں کیا رویہ اختیار کرنا چاہیے؟۔ رسول اللہ ﷺ نے ایک اُصول بیان فرمادیا ہے کہ جب تم میں سے کوئی شخص کسی برائی کو دیکھے تو اوّل اسے ہاتھ سے روکنے کی کوشش کرے، اگر اس پر قادر نہ ہو تو زبان سے اور یہ بھی ممکن نہ ہو تو دل سے، یعنی دل سے برا سمجھے، اور دل میں یہ ارادہ رکھے کہ اللہ تعالیٰ جب بھی قدرت دیں گے، وہ اُسے روکنے کی کوشش کرے گا، (ابوداؤد، حدیث نمبر: ۴۳۴۴) ظلم وجور سے بڑھ کر کوئی منکر اور بُرائی نہیں، یہ تو دنیا میں شرک سے بھی بڑھ کر ہے؛ کیوں کہ دنیوی احکام کی حد تک شرک کو گوارا کیا جاسکتا ہے؛ لیکن ظلم ایسی بُرائی ہے کہ وہ کس طور پر قابل قبول نہیں، کفر وشرک بھی ایسا جرم نہیں کہ جو شخص پہلے سے اس عقیدہ پر ہو، اُسے قتل کرنا جائز ہو؛ لیکن اگر کوئی شخص کسی کا مال لے لے، کسی کی عزت وآبرو پر حملہ آور ہو، یا کسی کو قتل کردے تو وہ ضرور لائق سزا ہے، پس ظلم سب سے بڑی برائی ہے اور اپنی طاقت وصلاحیت بھر اس کی مخالفت واجب ہے!

مخالفت اور ناراضگی کے اظہار کا ایک طریقہ ترک تعلق بھی ہے اور ظالموں کے ساتھ ترک تعلق کی تعلیم خود قرآن مجید نے دی ہے، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

يَـٰٓأَيُّهَا ٱلَّذِينَ ءَامَنُوا۟ لَا تَتَّخِذُوا۟ ٱلْيَهُودَ وَٱلنَّصَـٰرَىٰٓ أَوْلِيَآءَ ۘ بَعْضُهُمْ أَوْلِيَآءُ بَعْضٍ ۚ وَمَن يَتَوَلَّهُم مِّنكُمْ فَإِنَّهُۥ مِنْهُمْ ۗ إِنَّ ٱللَّهَ لَا يَهْدِى ٱلْقَوْمَ ٱلظَّـٰلِمِينَ. (المائدۃ:۵۱)

ترجمہ: اے ایمان والو! یہود ونصاریٰ کو دوست نہ بناؤ، وہ ایک دوسرے کے دوست ہیں اور تم میں سے جو ان کو دوست رکھے گا، وہ ان ہی میں سے ہوگا، بے شک اللہ ظلم شعار لوگوں کو ہدایت نہیں دیتے۔

اس آیت میں ایک جامع لفظ ''دوست نہ بنانے'' کا استعمال کیا گیا ہے، یہ ایک معنی خیز تعبیر ہے، جس میں قلب ونگاہ کی محبت، فکر ونظر میں تاثر، سماجی زندگی کی مماثلت اور مالی معاملات وتعلقات سب شامل ہیں، یہ کوئی شدت پر مبنی حکم نہیں ہے؛ بلکہ ظلم کے خلاف ناراضگی کے اظہار کا ایک طریقہ ہے، اس آیت کے اخیر میں ظالموں کا تذکرہ کرکے اس بات کی طرف اشارہ فرمایا گیا کہ جو یہود ونصاریٰ ظلم وجور پر کمربستہ ہوں، مسلمانوں کے لیے اپنی طاقت وقدرت کے مطابق ان سے بے تعلقی برتنا واجب ہے۔

اللہ تعالی نے ایک اور موقع پر اس حکم کو مزید وضاحت کے ساتھ بیان فرمایا ہے، ارشاد ہے:

إِنَّمَا يَنْهَىٰكُمُ اللَّهُ عَنِ الَّذِينَ قَٰتَلُوكُمْ فِي الدِّينِ وَأَخْرَجُوكُم مِّن دِيَٰرِكُمْ وَظَٰهَرُوا۟ عَلَىٰٓ إِخْرَاجِكُمْ أَن تَوَلَّوْهُمْ وَمَن يَتَوَلَّهُمْ فَأُو۟لَٰٓئِكَ هُمُ الظَّٰلِمُونَ. (الممتحنہ:۹)

ترجمہ: بے شک اللہ تم لوگوں کو ان لوگوں سے تعلق رکھنے سے منع کرتے ہیں، جنھوں نے تم سے دین کے معاملہ میں جنگ کی، تم کو تمہارے گھروں سے نکالا اور تمہارے نکالنے میں ایک دوسرے کی مدد کی اور جو ان سے تعلق رکھیں، وہ بھی ظالم ہیں۔

گھروں سے نکالنا محض دین کی بنا پر آمادۂ قتل وقتال ہونا اور جو لوگ مسلمانوں کے شہروں اور آبادیوں کو ویران کرنے پر تلے ہوئے ہوں، ان کو مدد پہنچانا، یہ وہ اوصاف ہیں جن کے حامل بدطینت یہودیوں اور نصرانیوں سے بے تعلقی برتنے کا حکم دیا گیا ہے، غور کیجیے کہ کیا آج امریکہ و برطانیہ ان جرائم کے مرتکب نہیں ہیں؟ کیا یہ حقیقت نہیں ہے کہ بوسنیا میں مسلمانوں کے قتل عام میں در پردہ برطانیہ نے ظالم سربوں کی مدد کی ہے، کیا یہ حقیقت نہیں ہے کہ ان ممالک کی جفا کاریوں اور ستم انگیزیوں کی وجہ سے افغانستان کے مسلمان بڑی ابتلاؤں سے گزر رہے ہیں؟ کیا یہ اس ظالم اسرائیل کے ناصر و مددگار نہیں ہیں، جو آئے دن بے قصور فلسطینی مسلمانوں کا قتل عام کرتے ہیں؟ اور جنھوں نے لاکھوں فلسطینیوں کو اپنے مادر وطن میں رہنے کے حق سے بھی محروم کر دیا ہے؟ قرآن نے جن یہود و نصاریٰ سے بے تعلق ہونے اور رشتۂ محبت کاٹ لینے کا حکم دیا ہے، ان مغربی طاقتوں میں ان میں سے کون سی بات نہیں پائی جاتی؟ پھر کیا ایسے اعداء دین سے بے تعلقی واجب نہ ہوگی؟

لَّا يَنْهَىٰكُمُ اللَّهُ عَنِ الَّذِينَ لَمْ يُقَٰتِلُوكُمْ فِي الدِّينِ وَلَمْ يُخْرِجُوكُم مِّن دِيَٰرِكُمْ أَن تَبَرُّوهُمْ وَتُقْسِطُوٓا۟ إِلَيْهِمْ إِنَّ اللَّهَ يُحِبُّ الْمُقْسِطِينَ. (الممتحنہ:۸)

ترجمہ: اللہ تعالیٰ تمہیں ان غیر مسلموں کے ساتھ حسن سلوک اور انصاف سے نہیں روکتا جنھوں نے تم سے دین کے بارے میں جنگ نہ کی ہو اور تمہیں تمہارے گھروں سے نہ نکالا ہو، بے شک اللہ انصاف کرنے والوں کو پسند کرتے ہیں۔

جو غیر مسلم بھائی انصاف کی روش پر قائم ہوں، وہ ہمارے انسانی بھائی ہیں اور ہمارے برادرانہ سلوک اور حسن اخلاق کے مستحق ہیں اور ان کے ساتھ زیادتی کسی طور جائز نہیں۔ بے تعلقی کا حکم ان لوگوں سے ہے، جنھوں نے اسلام اور مسلمانوں کے بارے میں جارحانہ اور نامنصفانہ روش اختیار کر رکھی ہو، یہ سمجھنا کہ کسی خاص شخص کی حوالگی یا کسی خاص مطالب کی تکمیل مغربی طاقتوں کو مطمئن

کردے گی اور اسلام کے خلاف بغض وعناد کی جو آگ ان کے سینوں میں سلگی ہوئی ہے، اسے بجھانے میں کامیاب ہوجائے گی، محض ایک طفلانہ خیال ہے، اس عناد کا اصل نشانہ اسلامی فکر وعقیدہ، اسلامی تہذیب وثقافت اور مسلمانوں کا قبلۂ اول مسجد اقصیٰ ہے، قرآن نے یہود ونصاریٰ کی نفسیات اوران کے اندرونی جذبات کی خوب ترجمانی کی ہے اور یہ بات جس قدر رسول اللہ ﷺ کے عہد میں مبنی برواقعہ تھی، اسی قدر آج بھی ہے کہ:

وَلَنْ تَرْضَىٰ عَنكَ الْيَهُودُ وَلَا النَّصَارَىٰ حَتَّىٰ تَتَّبِعَ مِلَّتَهُمْ قُلْ إِنَّ هُدَى اللَّهِ هُوَ الْهُدَىٰ وَلَئِنِ اتَّبَعْتَ أَهْوَاءَهُم بَعْدَ الَّذِي جَاءَكَ مِنَ الْعِلْمِ مَا لَكَ مِنَ اللَّهِ مِن وَلِيٍّ وَلَا نَصِيرٍ. (البقرہ:۱۲۰)

ترجمہ: یہود ونصاریٰ آپ سے اس وقت تک راضی ہو ہی نہیں سکتے، جب تک آپ ان کے دین کے پیرو نہ ہوجائیں، آپ کہہ دیجیے کہ ہدایت تو وہ ہے جو اللہ کی ہے، اگر آپ علم حاصل ہونے کے بعد بھی ان کی خواہشات کی پیروی کرنے لگیں تو آپ کے لیے اللہ کے مقابلہ کوئی حامی ومددگار نہ ہوگا۔

قرآن نے اس میں یہود ونصاریٰ کے اندرونی جذبات کو کھول کر رکھ دیا ہے اور خلافتِ عثمانیہ کے سقوط سے اب تک عالم اسلام میں جو جنگیں ہوئی ہیں، وہ سب اس کے واضح شواہد ہیں؛ اس لیے جب تک مسلمان اپنے مذہبی تشخصات اور اپنے ثقافتی امتیازات کو خیر باد نہ کہہ دیں، مسجد اقصیٰ سے اور اپنے مقدسات سے دستبردار نہ ہوجائیں اور پوری طرح مغربی فکر اور مغربی ثقافت کے سامنے جبین تسلیم خم نہ کردیں، ان کی تشفی نہیں ہوسکتی اور انشاء اللہ مسلمان کبھی اس کے لیے تیار نہیں ہوں گے؛ اس لیے کہ وہ دین کے لیے سب کچھ کھونے کو ''پانا'' اور اللہ کی راہ میں رگِ گلو کٹانے کو ''جینا'' تصور کرتے ہیں اور یہ ان کے ایمان وعقیدہ کا حصہ ہے!

اس پس منظر میں ہم مسلمانانِ ہند قانون کے دائرہ میں رہتے ہوئے یہ ضرور کرسکتے ہیں کہ ملک کی رائے عامہ کو حقیقت پسند بنائیں اور انھیں حقیقی صورتِ حال کا ادراک کرنے میں مدد دیں، منصف مزاج ہندو بھائیوں (جن کی آج بھی اس ملک میں اکثریت ہے) کو ساتھ لے کر حکومت ہند سے خواہش کریں کہ وہ اپنی ناوابستہ پالیسی پر قائم رہے اور امریکہ واسرائیل کی آنکھ بند کرکے حمایت نہ کرے، وہ اس بات کو ملحوظ رکھے کہ ہمارے ملک کا مفاد عربوں کے ساتھ بہتر تعلق میں ہے، نہ کہ اسرائیل جیسے خودغرض اور قلاش ملک کی تائید میں۔

اس کے ساتھ ساتھ ہم امریکہ اور اسرائیل کی تجارتی اشیاء کا بائیکاٹ کریں، جس کی فہرستیں بھی اخبارات اور سوشل میڈیا میں آچکی ہیں کہ یہ بھی منکر پر ناراضگی کے اظہار اور ظالم سے بے تعلقی برتنے کا ایک مؤثر طریقہ ہے اور شرعاً بہ حیثیت مسلمان ہم اس بات کے مکلّف ہیں کہ اس سلسلہ میں جو طریقہ اختیار کرنا ہمارے لیے ممکن ہو، ہم اس سے دریغ نہ کریں، بعض حضرات کہتے ہیں کہ صرف مسلمانوں کے بائیکاٹ کرنے سے ان کا کیا نقصان ہوگا؟ یہ درست نہیں ہے، اول تو اگر مسلم ممالک بھی اس بائیکاٹ میں شامل ہو جائیں تو اس کے غیر معمولی اثرات مرتب ہوں گے، دوسرے: مسئلہ ان کو نقصان پہنچنے اور پہنچانے کا نہیں ہے؛ بلکہ اپنی طرف سے اظہار ناراضگی کا ہے، کتنے ہی واقعات پیش آتے ہیں کہ خاندان میں اختلاف پیدا ہوا اور اس کی وجہ سے ایک دوسرے کی دعوت میں شرکت سے گریز کرنے لگے، یہاں تک کہ بعض اوقات بات چیت بھی بند ہو جاتی ہے؛ حالاں کہ معلوم ہے کہ اس کے دعوت میں شریک نہ ہونے اور بات نہ کرنے سے دوسرے شخص کا کچھ بگڑنے والا نہیں ہے؛ لیکن مقصود اپنے جذبات کا اظہار ہوتا ہے، یہی جذبہ یہاں بھی ہونا چاہیے، غرض کہ یہ انسانی فریضہ ہے، یہ شرعی ذمہ داری ہے اور حمیتِ ایمانی اور غیرت اسلامی للکار کر ہم سے پوچھ رہی ہے کہ کیا ہم اس کے لیے بھی تیار نہیں ہیں؟؟

❊ ❊ ❊

فلسطین...تاریخ کے آئینے میں

از: مولانا یزید احمد نعمانی

وہ ارض مقدس جسے انبیاء کرام علیہم السلام کا مدفن ہونے کا شرف حاصل ہے، جس کے اردگرد برکت ہی برکت کا نزول ہے، جہاں سے پیغمبر آخرالزماں حضرت محمد ﷺ روح القدس کے ہمراہ سفر معراج کے لیے پابرکاب ہوئے، جس دھرتی پر سید الثقلین ﷺ نے نبیوں کی امامت کرا کے امام الانبیاء کا لقب پایا، جی ہاں وہی پرعظمت و پرشوکت زیتون کے درختوں سے آراستہ و پیراستہ سرسبز وشاداب بقعہ ارضی، جہاں اسلام کی عظمت رفتہ اور جنت گم گشتہ کا نشان قبلہ اول کی صورت میں موجود ہے، جس کے فاتح اوّل فاروق اعظم رضی اللہ عنہ تھے، جس کے درودیوار نے ابوبی کی تکبیر سنی تھی، جہاں خیر کا نور پھیلانے والوں اور شر کی تاریکی میں اضافہ کرنے والوں کے درمیان آخری مگر عظیم معرکہ بپا ہونے کا میدان سج چکا ہے، آج طاغوتی قوتوں کے زیرنگیں وقبضہ ہے۔ ''مغضوبین''، ''ضالین'' کے زیرسایہ وانتظام گزشتہ چھ عشروں سے مسلمانان فلسطین کا جانی، مالی اور اقتصادی استحصال میں مصروف عمل ہیں۔

''بھٹکی مادیت'' نے اپنے طرز فکر وسوچ اور بوالہوسی کا راگ اس طور پر الاپا ہے کہ غیر تو غیر ''اپنے'' بھی اس کی گردش اور بھنور میں غوطہ زن ہیں، فکر معاش، تعیش پسندی اور اپنی شکم سیری کی زنجیروں میں ایسے جکڑے ہیں کہ اپنے آقا ﷺ کے اس ارشاد مبارک کو ہی بھلا بیٹھے، جس میں آپ نے مسلمانوں کی اجتماعیت کی تشبیہ ایک جسم سے دی ہے، بدن کے ایک عضو کی تکلیف والم پورے وجود میں سرایت کرتی اور محسوس کی جاتی ہے۔ تو پھر کیا وجہ ہے، عالم اسلام کے اس رستے ہوئے ناسور پر کوئی اینکر پرسن، کوئی وزیر ومشیر اور کوئی صاحب منصب وجاہ امت کی منتشر سوچ کو مجتمع، منظّم اور مربوط نہیں کرتا؟ آیئے اسی چبھتے سوال کے جواب کے تناظر میں ''بقعہ نور'' کی قدیم تاریخ پر ایک طائرانہ نظر ڈالیں جو شاید ہمارے ''خوابیدہ'' دلوں کو بیدار کرنے میں قوت عمل مہیا کر جائے!

محل وقوع کے اعتبار سے فلسطین براعظم ایشیا کے مغرب میں بحرمتوسط کے جنوبی کنارے پر واقع ہے اس علاقے کو آج کل مشرق وسطیٰ بھی کہا جاتا ہے، شمال میں لبنان اور جنوب میں خلیج عقبہ واقع ہے، جنوب مغرب میں مصر اور مشرق میں شام اور اردن سے اس کی سرحدیں ملی ہوئی ہیں۔ جبکہ مغرب میں بحرمتوسط کا طویل ساحل ہے، فلسطین کا رقبہ حیفہ اور غزہ سمیت ۲۷ ہزار کلومیٹر پر مشتمل ہے۔

فلسطین کے طبعی جغرافیائی علاقوں میں فلسطین کا طویل ساحل جو ناقورہ سے لے کر رفح تک جنوب میں پھیلا ہوا ہے سرفہرست ہے۔ جس کا عرض ۱۶ سے ۱۸ کلومیٹر تک ہے، اس ساحل کے مشہور شہروں میں طولکرم، خان یونس، رملہ، عکا، یفا، یافا اور غزہ ہیں۔ اسرائیل نے اپنا دارالحکومت بھی یافا کے شمال میں بنایا ہے، جبکہ پہاڑی سلسلوں میں نابلس، کرمل، خلیل اور القدس کے پہاڑی علاقے مشہور ہیں، واضح رہے کہ خلیل پہاڑ کے دامن میں خلیل شہر آباد ہے جس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام یہاں مدفون ہیں۔ علاوہ ازیں قدس کے پہاڑوں میں سب سے اونچا پہاڑ جبل طور ہے، جس میں بیت المقدس کا علاقہ واقع ہے، مسجد اقصیٰ اور قبۃ الصخرہ بھی اسی شہر کی زینت ورونق ہیں۔ میدانی علاقوں میں نقب اور اغوار کے علاقے شامل ہیں، اغوار فلسطین کا مشرقی علاقہ ہے، جسے دریا اردن کاٹتا ہے اور بحرمیت بھی اس کے کنارے واقع ہے، اس علاقے میں اریحا نامی شہر ہے، جس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ دنیا کا قدیم ترین شہر ہے۔

فلسطین اپنی تاریخ کے ابتدائی دور میں کنعانیوں کا مرکز رہا ہے، ان علاقوں میں جتنے قدیم شہر تھے وہ سارے کنعانیوں نے ہی آباد کیے تھے، کنعانی قبیلے کی اہم شاخ ''یبوسی'' قوم نے القدس شہر بسایا تھا۔ کنعانی دور کے بعد عبرانی دور کی باری آتی ہے، حضرت ابراہیم علیہ السلام نے ارض کنعان کی طرف ہجرت فرمائی، بعد میں حضرت یوسف علیہ السلام کے ذریعے آپ کی اولاد مصر کی حکمراں بنی، پھر بتدریج قبطی ان پر غالب آئے اور حضرت موسیٰ علیہ السلام نے انہیں مصر سے نکالا، حضرت موسیٰ علیہ السلام کے بعد حضرت یوشع بن نون کی قیادت میں ان عبرانیوں نے کنعان کو فتح کیا یہاں سے عبرانی دور کا آغاز ہوا، عبرانیوں کے حکمرانوں میں دو جلیل القدر پیغمبر حضرت داؤد اور حضرت سلیمان علیہما السلام بھی گزرے ہیں۔

''بلست'' نامی قبیلہ مغرب سے جنگ زدہ ہوکر نکلا، اس نے اس علاقے کے ساحلی علاقوں یافا سے غزہ تک کے علاقے پر قبضہ کرلیا، اس قبیلے نے اپنے مقبوضہ علاقے کا نام اپنے نام سے موسوم کرکے فلسطین رکھ دیا یہ نام ایسا غالب رہا کہ آج اس پورے خطے کو فلسطین ہی پکارا جاتا ہے، ان نو وارد

فلسطینیوں اور عبرانیوں کے مابین کئی جنگیں ہوئیں، جس کے نتیجہ میں حضرت داؤد علیہ السلام نے اس کے سردار جالوت کو قتل کردیا جس کا تذکرہ قرآن مجید میں بھی ہے۔

۵۳۸ ق م میں فارس کے ایک بادشاہ نے شام کو پورے علاقے کو بشمول فلسطین قبضہ کرلیا، فارس کی حکومت ۳۳۲ ق م یہاں سے ختم ہوگئی۔ ۳۳۲ ق م میں ہی مقدونی بادشاہ سکندر اعظم نے یہ علاقہ فارسیوں سے ہتھیالیا، اس کی موت کے بعد اس کے جانشینوں نے یہاں یونانی ثقافت وتہذیب کو پروان چڑھانے کی سرتوڑ کوشش کی، اس مقصد برآوری کی خاطر انھوں نے کئی شہر آباد کئے، مدارس کھولے یونانی زبان کو سرکاری زبان قرار دیا، لیکن اکثر علاقوں میں سریانی زبان وتہذیب کو لوگوں نے حرز جان بنائے رکھا۔

۶۳ ق م میں روم کے مشہور قائد ''بومپی'' نے یونانیوں کا زور فلسطین میں توڑ ڈالا، پھر یہ علاقہ رومیوں کے پاس رہا، یہاں تک کہ ۶۳۶ء میں اسلام کا پھریرا اس علاقہ پر لہرایا، اس دور کی اہم خصوصیات میں سے چند اہم یہ ہیں: (۱) حضرت مسیح علیہ السلام کا ظہور ہوا۔ (۲) یہودیوں کو دومرتبہ شکست ہوئی۔ پہلی مرتبہ ۷۰ء میں تیطس رومی کے ہاتھوں ذلیل وخوار ہوئے اور دوسری دفعہ ۱۳۵ء میں جب یہود نے دوبارہ منظّم ہونے کی کوشش کی، اس دور کے رومی بادشاہ ''معادریان'' نے خود حملہ کیا اور یہودیوں کو سفاکی سے قتل کیا اور باقی کو دنیا کے مختلف علاقوں میں جلاوطن کیا اب دو ہزار سال بعد اس دھتکاری ہوئی قوم کو فلسطین میں اپنے قدم جمانے کا موقع ملا ہے۔

فلسطین کی اہمیت اسلام اور مسلمانوں کے لیے اس حوالے سے بہت واضح رہی ہے کہ ابتداء اسلام میں یہ ان کا قبلہ اوّل رہا ہے، اسی وجہ سے رومیوں کے ساتھ معرکے حضرت جناب نبی کریم ﷺ کی حیات طیبہ ہی میں شروع ہوگئے تھے۔ سرور دوعالم ﷺ نے اپنا آخری لشکر جیش اسامہ رومیوں کے مقابلے کے لیے ترتیب دیا ہی تھا کہ آپ اس دنیا سے پردہ فرما گئے، آپ کے بعد حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے اسے روانہ فرمایا، ارتداد کی مہم سے فارغ ہوکر خود بھی اس جانب توجہ دی۔ یہاں تک کہ ۶۱ھ میں حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کے دور خلافت میں بیت المقدس مسلمانوں کے زیر قبضہ آگیا۔

چھٹی صدی ہجری میں بلاد اسلامیہ پر صلیبیوں نے حملہ کیا، جس کے نتیجے میں فلسطین میں صلیبی حکومت قائم کرلی گئی، طاقت اور قوت کے بل بوتے پر ستر ہزار مسلمانوں کو تہہ تیغ کیا گیا، لیکن صلیبیوں کی یہ حکومت دیرپا ثابت نہ ہوسکی مشہور مجاہد صلاح الدین ایوبی نے جلد ہی بیت المقدس کو صلیبی پنجہ

استبداد سے واکرالیا، ۲۷؍رجب ۵۳۸ھ کو بیت المقدس دوبارہ تکبیر کے زمزموں سے گونج اٹھا۔

جس وقت عالم اسلام کو استعماری طاقتوں نے اپنی سازشوں کا ہدف بنایا اور فلسطین کی سرزمین برطانیہ کے استعماری قبضہ میں آنے لگی تو مکار اور شاطر یہودیوں نے اس موقع کو غنیمت سمجھ کر اس خطے کے حصول کی خاطر کوششیں تیز کردیں ۱۸۳۹ء میں سب سے پہلا مغربی سفارتخانہ جو بیت المقدس میں کھلا وہ حکومت برطانیہ کا تھا، جس کا واحد مقصد یہودیوں کی خدمت گذاری تھا، اس کے ساتھ ہی پوری دنیا سے یہودیوں کو بیت المقدس میں جمع کرنا شروع کردیا گیا، اس وقت پورے فلسطین میں صرف نو ہزار کے قریب یہودی تھے۔

۱۸۹۵ء میں ایک یہودی مفکر ''النمساوی ہیرتسل'' نے ایک کتاب شائع کی جس کا عنوان تھا ''یہودی مملکت'' جس میں اس بات کو ثابت کرنے کی کوشش کی گئی تھی کہ یہودی قوم کو ایک حکومت کی ضرورت ہے، اس مقصد کے لیے فلسطین سے بہتر کوئی جگہ ان کی نظر میں نہ تھی۔ اس دور میں یہودیوں کی عالمی سطح پر دو بڑی کانفرنسیں ہوئیں، پہلی کانفرنس ۱۸۹۷ء اور دوسری ۱۸۹۸ء میں، جن کا حاصل یہ تھا کہ یہود اپنے قدیم وطن فلسطین کو دوبارہ حاصل کرنے کے لیے منظّم ہوجائیں، چونکہ فلسطین خلافت عثمانیہ کا ایک حصہ تھا اور وہی اس کے مالک ومتصرف تھی، اس کے مقابلے کے لیے قوم یہود نے ہر طرح کے حربے استعمال کرنے شروع کردیئے۔

خلافت عثمانیہ کے آخری خلیفہ سلطان عبدالحمید کو اپنے دام تزویر میں پھنسانے کے لیے انھوں نے مختلف سطحوں پر ساز باز شروع کی، جس میں بھاری رقوم دے کر ترکوں کو خریدا گیا، خود خلیفہ عبدالحمید کو لالچ دیئے گئے یہاں تک کہ ایک دفعہ ترکی کے یہودیوں کا ایک وفد سلطان سے ملا اور ان کو یہ باور کرانے کی کوشش کی کہ فلسطین اگر یہودیوں کو دے دیا جائے تو اس کے بدلے ہم خلافت عثمانیہ کے ماتحت رہ کر خلافت کے سارے قرضے اتار دیں گے، جواب میں سلطان نے زمین سے ایک تنکا اٹھا کر ان کو دکھایا پھر فرمایا ''اگر فلسطین کا اتنا حصہ بھی تم لینا چاہو گے تو نہیں ملے گا''۔

سلطان عبدالحمید سے مایوس ہوکر اللہ کے غضب کی ماری اس قوم نے ان کی شہرت عام کو بگاڑنے کی کوشش شروع کردی، چونکہ ذرائع ابلاغ پر یہودیوں کی اجارہ داری تھی اس لیے اس ہتھیار سے کام لے کر سلطان پر ''رجعت پسند یا ورنسل پرست'' جیسے بے پر کے الزامات کا سلسلہ شروع کردیا گیا، نتیجتاً خلافت عثمانیہ میں قومی نعروں کی پروان ملی۔

۱۹۰۹ء سلطان عبدالحمید کا انتقال ہوا تو گویا اس دن سے اسرائیل کے وجود کی بنیاد پڑ گئی،

حکومت میں موجود صہیونیت نواز لوگوں کا ایک ایسا طبقہ موجود تھا جو برابر یہودیوں کو فلسطین منتقل کرنے میں مدد دیتا رہا، یہاں تک کہ ۱۸۹۷ء میں ان کی تعداد پچاس ہزار تھی اور یہی تعداد ۱۹۱۴ء میں ۸۵ ہزار ہوگئی۔

یہود ایک مالدار قوم تھے، ہر ملک میں بڑے بڑے بیوپاریوں اور ساہوکاروں کی صورت میں موجود تھے، جس کی وجہ سے ملکوں کی سیاست اور معاملات پر ان کا اثر انداز ہونا کوئی تعجب خیز امر نہیں تھا، انھوں نے خلاف عثمانیہ کو ہر طرح اور ہر سطح پر دباؤ میں رکھنے کی کوشش کی، اور دنیا کو باور کرایا کہ فلسطین کا حصول یہودیوں کے لیے ناگزیر ہے، لیکن خلافت عثمانیہ ان کے باطل عزائم اور ارادوں کے سامنے سد سکندری ثابت ہورہی ہے۔ چنانچہ اس بے حقیقت مفروضے کی بنیاد پر حکومت مصر کے توسط سے صحراء سینا میں یہودیوں کو بسانے کی ایک مرتبہ کوشش بھی کی گئی، جس میں وہ ناکام ہوئے۔ اس کے بعد دنیا کی سیاست میں کچھ ایسے حالات آئے جو فلسطین میں بدی کی ''نمائندہ قوم'' کے لیے قیام حکومت کی راہ ہموار کرتے چلے گئے، جن میں چار حالات کا بطور خاص ذکر ضروری معلوم ہوتا ہے: (۱) دو عالمی جنگوں کا وقوع پذیر ہونا۔ (۲) ہٹلر کے ہاتھوں یہودیوں کا قتل عام جس سے وہ دنیا کو اپنی مظلومیت ثابت کر پائے۔ (۳) خلافت عثمانیہ کا سقوط۔ (۴) فلسطین کا برطانوی استعمار کے زیر دست ہوجانا۔

آخر الذکر سبب کے تحت برطانوی استعمار نے یہودیوں کو فلسطین میں بسانے کے لیے حتی المقدور تعاون کیا۔ مقامی باشندوں کو ان کی زمینوں سے بے دخل کیا گیا، یہودی بستیاں آباد کی گئیں، تل ابیب کو مضبوط کیا، یہودیوں کے استحکام سے مطمئن ہوکر خود ۱۴رمئی ۱۹۴۸ء کو فلسطین سے نکلنے کا اعلان کیا، جاتے جاتے اہم مقامات، سرکاری دفاتر، ہوائی اڈے یہودیوں کو بطور بخشش دے گئے، جبکہ مسلمانوں کا جانی، مالی اور اقتصادی استحصال کیا گیا، جس کے نتیجے میں کچھ قتل ہوئے اور اکثر ہجرت پر مجبور ہوئے۔

یوں ۱۵رمئی ۱۹۴۸ء کو اسرائیلی مملکت کا اعلان قیام ہوا، جسے چند ہی لمحوں میں امریکہ، روس اور یورپ نے تسلیم کرلیا، اسلامی ممالک میں سے صرف ترکی اور اس وقت کے شاہ ایران نے یہ ناجائز ریاست تسلیم کرکے اپنے فکری ضلالت پر مہر تصدیق ثبت کی۔

❋ ❋ ❋

اسرائیل-فلسطین کا قضیہ کیا ہے؟

از: اشتیاق احمد ربانی
علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

فلسطین اور اسرائیل جنگ کی بنیاد، مسجد اقصیٰ کو سمجھنے والے حضرات کے لیے اطلاعاً عرض ہے کہ جس جگہ مسجد اقصیٰ ہے وہ پورا علاقہ یروشلم کا علاقہ کہلاتا ہے۔ اقوام متحدہ نے فلسطین کو تین حصوں میں تقسیم کیا تھا (۱) اسرائیل (۲) فلسطین (۳) یروشلم یہ یروشلم (اسی علاقہ میں مسجد اقصی واقع ہے) یہ یروشلم کا علاقہ تینوں مذاہب، یہودی، عیسائی اور مسلمانوں کے یہاں مقدس سمجھے جانے کی وجہ سے اس علاقہ کو اقوام متحدہ نے اپنی نگرانی میں لے لیا اور اس کو ''ورلڈ ہیریٹیج'' قرار دے دیا یعنی اس علاقہ کو تمام مذاہب کے لوگوں کا ورثہ قرار دے دیا؛ چنانچہ جو لوگ فلسطین اور اسرائیل جنگ کی خبر سن کر فلسطینی معصوم بچوں کے درد کو سمجھنے کے بجائے، صرف مسجد اقصیٰ کی حفاظت کے نعروں اور اس کی مسماری اور قبضہ کے لاجواب علم تک محدود ہو جاتے ہیں انھیں یہ معلوم ہو کہ آج بھی مسجد اقصیٰ کے باہری حصہ کی نگرانی اسرائیلی فوج کرتی ہے اور مسجد اقصی میں وہ لوگ بھی جہاں وہ لوگ اپنی عبادت کی جگہ اپنے لیے تصور کرتے ہیں وہاں عبادت کرتے ہیں، یہود مسجد اقصیٰ کے اندر اس لیے نہیں جاتے کہ ان کا ماننا ہے کہ یہ مقدس جگہ ہے اور ہمارے لیے اپنی اس مقدس جگہ پر پاؤں رکھنا بے ادبی ہے۔ مسجد اقصیٰ کے اندرونی حصہ کا انتظام مسلمانوں کے ہاتھوں میں ہوتا ہے اور وہ اپنی عبادت پنج وقتہ نماز وغیرہ انجام دیتے ہیں اور مسجد کے باہری حصہ کی دیکھ ریکھ اسرائیلی فوج کرتی ہے۔

مظلوم فلسطینی عوام کے درد، تڑپ، کڑھن اور جنگ کی اصل وجہ مسجد اقصیٰ ہے ہی نہیں؛ بلکہ اسرائیل کے ساتھ ان کی جنگ کی بنیاد ان کی شناخت کی بقاء اور اپنی زمین کی حفاظت کی ہے، جو کہ غاصب اسرائیل اپنی طاقت اور قوت کے بل بوتے پر زبردستی انٹرنیشنل لاء، عالمی قوانین کی دھجیاں اڑا کر روز بروز نئے نئے قوانین بنا کر فلسطینیوں کو زبردستی ان کے مکانوں پر بلڈوزر چلوا کر ان کی

زمینوں پر قبضہ کرتا چلا آرہا ہے۔

اوراب ایسا لگ رہا ہے کہ کچھ ہی دنوں میں فلسطینی حکمرانوں کے اندرونی اسرائیلی حمایت سے پورے فلسطین پر اسرائیل کا قبضہ ہوا چاہتا ہے۔!

اوراس خدشہ میں قوت فلسطینی حکمرانوں کے ذریعہ، اپنے دفاع کے لیے اپنی فوج اور آرمی کے قیام نہ کرنے کی وجہ سے ہے۔!!

حماس، جس کو کچھ لوگ نہ جاننے کی وجہ سے دہشت گروپ کہنے لگے ہیں وہ دراصل فلسطین کا ایک دور دراز علاقہ (جیسے ماضی میں پاکستان کا دور دراز علاقہ مشرقی بنگال) ویسے ہی فلسطین کا اب بچا ہوا چھوٹا سا دور دراز علاقہ غزہ میں وہیں کے عوام کی ایک جماعت اپنے ملک کی حفاظت اور دفاع اور آزادی کے نام پر تشکیل دی گئی ایک جماعت کا نام حماس ہے، جو لوگ عالمی خوشنودی حاصل کرنے کے لیے حماس کو دہشت گرد گروپ کہہ رہے ہیں، وہ کیوں بھول جاتے ہیں کہ ان کی اس تھیوری کے حساب سے سارے ممالک کی فوج اور آرمی بھی دہشت گرد گروپ کہلائے گی۔!

اپنے ملک کے دفاع کے نام پر قائم کی جانے والی فوج اور آرمی کا قیام درست قرار دیا جاسکتا ہے تو پھر غزہ کے شہریوں کے ذریعہ اپنی دفاع کے لیے تشکیل دینے والی مجاہدین کی جماعت حماس کا قیام کیوں نہیں۔

کیا اس لیے نہیں کہ اس نے اپنے دفاعی فوج کا نام آرمی رکھنے کے بجائے مجاہدین رکھ دیا۔!

اسرائیل کو فوج، آرمی اور اسلحہ رکھنے اور بنانے کی پوری اجازت دی جاسکتی ہے؛ لیکن فلسطین کو نہ فوج، نہ آرمی اور نہ ایٹم بم اور اسلحہ رکھنے اور خریدنے کی اجازت دی جاسکتی ہے۔! یہ انصاف سے پرے بات ہے!

فلسطین پہلے عثمانیہ سلطنت کے زیر اثر تھا، 1917/18 میں پہلی جنگ عظیم کے خاتمہ کے بعد یہ پورا فلسطین کا علاقہ برطانیہ نے اپنی دیکھ ریکھ میں لے لیا اور یہ علاقہ وہاں کے عوام کو سپرد کرنے کے بجائے یہودیوں کو بسانے اور قبضہ جمانے کی خطرناک مہم اسی انگریز ملک برطانیہ نے شروع کی تھی، چنانچہ 1948 میں اس کو اقوام متحدہ کے سپرد کر کے یعنی معاملہ کو اقوام متحدہ لے جا کر اس کو تین حصوں میں تقسیم کروادیا، جس کی تفصیل اوپر بیان کی جاچکی ہے۔

ہر ایک ملک کی ایک متعین سرحد اور باونڈری ہوتی ہے؛ لیکن اسرائیل ایک ایسا ملک ہے جس کا اب تک کوئی فکس باونڈری نہیں ہے، وہ کہتا ہے ہماری کوئی فکس باونڈری نہیں ہے اور دھیرے

دھیرے پورے فلسطین پر قبضہ کرتا چلا جارہا ہے، یہاں تک کہ اسرائیل اس وقت پورے فلسطین لینڈ یعنی زمین کا 78 فیصد حصہ قبضہ کرچکا ہے؛ جبکہ 1948 کے اقوام متحدہ کے فیصلہ کے حساب سے 55 فیصد زمین کا رقبہ اسرائیل کو اور 45 فیصد حصہ زمین کا رقبہ فلسطین کو دیا گیا تھا یہ الگ بات ہے کہ عرب ممالک نے اس فیصلہ کو تسلیم نہیں کیا تھا؛ لیکن اسرائیل نے تو اس فیصلہ کو تسلیم کیا تھا، اسے تو کم سے کم اپنے اسی اقوام متحدہ کے فیصلہ پر برقرار رہنا چاہئے تھا۔!

اسرائیل اپنے خطرناک عظیم منصوبے گریٹر اسرائیل کے قیام کی طرف بڑھتا ہوا دکھائی دے رہا ہے جس کے مطابق سعودی عربیہ، کویت، دبئ، بحرین، عراق، ترکی، جارڈن، شام اور مصر کے کچھ یا پورے علاقے پر قبضہ کرکے پورے مسلم ممالک کو عظیم تباہی کے لیے تیار رہنے کا اشارہ دیا جارہا ہے۔

* * *

ضروری اطلاع

بیرون ملک: برطانیہ، امریکہ، افریقہ، عرب ممالک وغیرہ کے لیے حسب سابق ''ماہنامہ دارالعلوم'' کی روانگی شروع کردی گئی ہے۔ مذکورہ ممالک کیلئے سالانہ زرتعاون پندرہ سو(۱۵۰۰) روپے ہے۔

اس کے علاوہ بنگلہ دیش، نیپال اور پاکستان کے لیے بھی ماہنامہ دارالعلوم کی روانگی شروع کردی گئی ہے۔ مذکورہ ممالک کے لیے ہندوستانی کرنسی میں سالانہ زرتعاون آٹھ سو (۸۰۰) روپے ہے۔

اور پاکستانی خریدار حضرات درج ذیل پتے پر رسالہ جاری کرنے کے لیے رابطہ کرسکتے ہیں:

مولانا سیّد رشید میاں صاحب ناظم جامعہ مدنیہ راوی روڈ کریم پارک، لاہور پاکستان

(ادارہ)

قضیہ فلسطین اور موروثیت

از: پروفیسر ڈاکٹر انیس احمد

''فلسطین'' جسے تاریخ میں ''شام'' کہا جاتا تھا انسانی تہذیبوں میں اپنی سیاسی، معاشی، مذہبی اور ثقافتی وجوہات کی بنا پر صہیونی غیر قانونی تسلط سے قبل بھی اپنا الگ مقام رکھتا تھا اور اسے یہودی اور عیسائی روایات میں بھی تقدس حاصل تھا۔ قرآن کریم میں اسی علاقے کے حوالے سے سورہ بنی اسرائیل یا اسراء کے آغاز میں یوں ارشاد ہے ''پاک ہے وہ جو لے گیا ایک رات اپنے بندے کو مسجد حرام سے دور کی اس مسجد تک جس کے ماحول کو اس نے برکت دی ہے؛ تاکہ وہ اسے اپنی کچھ نشانیوں کا مشاہدہ کرائے۔'' (۱:۱۷)۔ تفصیلات میں جائے بغیر اس آیت مبارکہ میں پہلی بات یہ واضح کر دی گئی ہے کہ ''الصخرۃ'' کے اردگرد کا ماحول خصوصیت رکھتا ہے اور اسے اللہ تعالیٰ نے برکت سے نوازا ہے۔ یہی سبب ہے کہ ''الاقصیٰ'' یا دُور والی مسجد کو ''القدس'' نہ صرف عربی؛ بلکہ عبرانی زبان میں بھی کہا گیا ہے۔

دوسری بات یہ سمجھائی گئی ہے کہ اس میں اہلِ دانش کے لیے نشانیاں ہیں یعنی قوموں کے عروج وزوال کی داستان کے بعض اہم ابواب کا تعلق اس خطہ کے ساتھ ہے۔ یہاں قرآن کریم نے یہودی اساطیر کے اس نقطۂ نظر سے مکمل طور پر اختلاف کیا ہے جس میں یہودیوں کے ''منتخب قوم'' ہونے کی بنا پر گویا انھیں ''القدس'' وراثت میں اس طرح دے دیا گیا ہے کہ اس کی تولیت نسلاً بعد نسل صرف یہودی تخم رکھنے والی نسل ہی میں رہے۔ قرآن کریم زمین اور حیات بعد الممات میں انسانوں کو شرف دینے کا سبب نہ ان کی نسلی، لسانی، قبائلی یا خطے سے وابستہ عصبیت کو قرار دیتا ہے اور نہ ایسی کسی وراثت کا قائل ہے جو ازل تا ابد کسی ایک گروہ کے سپرد کر دی جائے۔

قرآنی اخلاقیات میں ان تعصّبات کی جگہ تقویٰ، بندگیٔ رب اور حاکمیت الٰہی کے قیام کو معیار قرار دیا گیا ہے؛ چنانچہ جب تک ایک گروہ انسانیت اس اخلاقی ضابطے پر عمل کرتا ہے زمین پر اختیار کا

مستحق قرار پاتا ہے ورنہ اس سے بہتر گروہ کے ذریعہ ایک تاریخی عمل کے طور پر تبدیلی لائی جاتی ہے۔ ''یہ تو زمانے کے نشیب وفراز ہیں جنھیں ہم لوگوں کے درمیان گردش دیتے رہتے ہیں'' (آل عمران ۳:۱۴۰)۔قوموں کے عروج وزوال کے قرآنی نظام میں للّٰہیت اور عدل کو بنیاد قرار دے کر یہ بات سمجھائی گئی ہے کہ جو قوم بھی اپنا تعلق رب سے جوڑنے کی بجائے جاہلانہ عصبیت وعربیت یا صہیونیت سے جوڑے گی اور بندگیِ رب کو نظر انداز کرتے ہوئے جادۂ عدل سے انحراف کرے گی وہ قیادت کی مستحق نہیں ہوسکتی۔

لیکن کیا اس کا مطلب یہ لیا جائے کہ اگر حقیقت واقعہ کے طور پر ایک سفاک طاغوتی قوت کسی خطہ پر قابض ہے اور اس کے افراد کو محکوم، مظلوم اور مستضعفین بنا کر ظلم کا نشانہ بنا رہی ہے تو اسے یہ اختیار دے دیا جائے اور یہ سمجھا جائے کہ طاغوت کے مسلط ہونے میں حمایت ربانی شامل ہے؟ بات بہت واضح ہے کہ جو عدل، رحم وکرم اور شفقت کا منبع ہے جو اپنے بندوں سے ہر لمحہ محبت کرتا ہے وہ طاغوت اور ظلم کی نہ تو پشت پناہی کرسکتا ہے نہ اسے ظلم کرتے ہوئے دیکھ کر خوش ہوسکتا ہے۔

یہی وجہ ہے کہ قرآن کریم نے ایسے مجبور وبے کس افراد کے حوالے سے یوں ہدایت کی ہے ''آخر کیا وجہ ہے کہ تم اللہ کی راہ میں ان بے بس مردوں، عورتوں اور بچوں کی خاطر نہ لڑو جو کمزور پا کر دبا لیے گئے ہیں اور فریاد کررہے ہیں کہ ہمارے رب ہم کو اس بستی سے نکال جس کے باشندے ظالم ہیں اور اپنی طرف سے ہمارا کوئی حامی ومددگار پیدا کردے۔'' (النساء۴:۷۵) گویا ظلم جہاں بھی ہو اور جس کسی کو اس کے اپنے گھر میں مجبور وبے کس بنادیا گیا ہو قرآنی اخلاقیات کا مطالبہ ہے کہ اسے طاغوت سے نجات دلانے میں مدد کی جائے اور حقوق انسانی کی بحالی کے لیے جہاد کو اختیار کیا جائے۔

اس تناظر میں دیکھا جائے تو صہیونی قابضوں کا یہ دعویٰ کہ ان کا فلسطین پر کوئی آبائی حق ہے، نہ قرآن کی روشنی میں اور نہ خود ان کے مصادر کی بنیاد پر کوئی سنجیدہ دعویٰ خیال کیا جاسکتا ہے۔ اس حوالے سے ریچل میسی نائے کا مقالہ Historiography in Relations to the Territory of Palestine قیمتی معلومات فراہم کرتا ہے اور بیک وقت لادینی ذہنیت رکھنے والے مفکرین اور دیگر حضرات کے تصورات کا خلاصہ پیش کرتا ہے۔ اس نوعیت کی علمی بحث سے قطع نظر فلسطین کے مسلم اور عیسائی باشندوں پر صیہونی مظالم بیسویں صدی کی تاریخ کے تاریک ترین باب سے تعلق رکھتے ہیں اور صرف سماعت، بینائی اور قوتِ عقل سے محروم شخص ہی فلسطینیوں کے حق خودارادیت کا انکار کرسکتا ہے۔

اس پورے قضیے میں مغربی طاقتوں کا گھناؤنا کردار بھی ایک شفاف تاریخی حقیقت ہے۔ برطانیہ ہو یا امریکہ ناموں کے فرق کے باوجود دونوں قوتوں نے اپنے مقدور بھر ظلم کا ساتھ دینے اور مظلوم فلسطینیوں کو عدل سے محروم رکھنے میں ایک سفاکانہ رویہ اختیار کیا ہے۔اس کا یہ مطلب نہیں کہ فلسطینیوں پر اس ظلم کے ذمہ دار صرف بیرونی دوست نما دشمن ہیں؛ بلکہ حقیقت واقعہ یہ ہے کہ خود فلسطینیوں کے بعض دھڑے اور نام نہاد عرب قومیت کے علمبردار ممالک نے زبانی جمع خرچ کے سوا آج تک کوئی ایسا اقدام نہیں کیا جو ان کی سنجیدگی کا پتہ دیتا ہو۔اگر پوری صورت حال کو اختصار کے ساتھ بیان کیا جائے تو تین عوامل بہت نمایاں طور پر کارفرما نظر آتے ہیں۔اولاً مغرب کے علمی اور ابلاغی حلقوں کی طرف سے ایک سوچی سمجھی حکمت عملی کے طور پر عالمی افق پر معلومات کا اس طرح نشر کرنا کہ فلسطینی ظالم، قاتل، دہشت گرد، خودکش حملہ آور اور بنیاد پرست اور سیامیت کش (anti-semlt) نظر آئیں اور ارض مقدس پر ناجائز قبضہ کرنے والے، نسل پرست، خود آلود ہاتھوں والے اسرائیلی اس ظلم کا نشانہ سمجھے جائیں۔معروف ماہر لسانیات ایڈورڈ سعید کی تصنیفات اس حوالہ سے انتہائی مستند حقائق فراہم کرتی ہیں۔

ثانیاً خود فلسطینیوں کو اس ابلاغی سازش کے نتیجہ میں نفسیاتی اور ذہنی طور پر دو بیماریوں میں مبتلا کردیا جائے یعنی اوّل یہ کہ وہ ایک کمزور، بے بس، پسماندہ لوگ ہیں جنھیں اگر کوئی خیرات دے دی جائے تو انھیں شکرگزار ہونا چاہیے گو وہ اس خیرات کے بھی مستحق نہیں ہیں؛ چنانچہ وہ صہیونیوں کی شرائط پر جن کی حمایت برطانیہ اور امریکہ روز اوّل سے کرتا آرہا ہے احسان مندی کے ساتھ عمل کرنے کے لیے آمادہ ہوں اور روٹی کے جو بھی ٹکڑے اُنھیں دے دیے جائیں، اس پر شاکر وشاداں ہونے کے لیے ذہنی طور پر تیار ہوجائیں۔دوم یہ کہ یہ تصور نہ صرف فلسطین کے مظلوم باشندوں؛ بلکہ نام نہاد عرب قومیت کے علمبردار ممالک کے فرمانرواؤں کے بھی ذہن نشین کرادیا جائے کہ مسئلہ کا حل صرف گفتگو سے ہی ہوسکتا ہے۔قوت کا استعمال کوئی کام نہیں کرے گا۔ یہ نصیحت اور تصور ان اقوام کی طرف سے گزشتہ ۶۰ سال سے پیش کیا جارہا ہے جو موجودہ دور کی تاریخ میں سب سے زیادہ قوت کے اندھے استعمال پر عمل کرکے کروڑوں افراد کے سفاکانہ قتل کی ذمہ دار ہیں اور صرف یہ جانتی ہیں کہ لاٹھی کے بغیر بھینس پر قبضہ نہیں ہوسکتا۔

بہرصورت اس بات میں لازماً صداقت پائی جاتی ہے کہ بعض قضیے گفتگو سے بھی طے ہوسکتے ہیں یہ اسی وقت ہوگا جب دوسرے فریق کو قرآن کریم کی الہامی حکمت کی روشنی میں، یہ احساس

ہوجائے کہ اس کا مقابلہ ایک سیسہ پلائی ہوئی دیوار کے ساتھ ہے، ایک ایسی قوم کے ساتھ ہے جس کی نگاہ میں موت کا خوف کوئی مقام نہیں رکھتا اور جو شہادت اور جہاد کو اپنا مقصد حیات سمجھتی ہے۔

اس کے برعکس اگر فریق مخالف کو یہ معلوم ہو کہ نام نہاد مسلم فرمانروا ہر اس بات کو لپک لپک کر خوش آمدید کہنے کے لیے بے تاب ہیں جو امریکہ کی طرف سے بطور ایک اشارہ کے بھی آجائے تو مذاکرات اپنا مفہوم کھو بیٹھتے ہیں۔ گویا کمزوری، لاچاری، بے بسی اور افلاس کے احساس کو روح اور دماغ میں اتنا جاگزیں کردیا جائے کہ اسرائیلی وکیل جو کچھ کہے اسے فوراً شکرگذاری کے احساس کے ساتھ مان لیا جائے۔ یہ ایک مسلسل نفسیاتی جنگ ہے جو ۶۰ سال سے لڑی جارہی ہے اور جس کے نتیجہ میں بعض نام نہاد قائدین آخرکار امریکہ کی ہر تجویز کو ماننے پر آمادہ ہوتے چلے گئے ہیں۔

ثالثاً اس مغربی اور صہیونی حکمت عملی کا ایک اہم جزو آبادی کے اس تناسب کو جو ۱۹۴۸ء سے ایک تاریخی حقیقت کی حیثیت رکھتا تھا اور جس میں مسلمان اور عیسائی فلسطینی اکثریت میں اور صہیونی اقلیت میں تھے اس طرح تبدیل کیا جائے کہ اگر فلسطینیوں کو کچھ ٹوٹے پھوٹے حقوق بطور خیرات دینے بھی پڑیں تو وہ ظالم اور قابض صہیونیوں کے لیے کبھی خطرہ نہ بن سکیں۔

اللہ تعالیٰ کا نظام بھی عجب ہے اس پورے عرصہ میں صہیونیوں نے چھانٹ چھانٹ کر فلسطینی نوجوانوں کو تشدد اور قتل کا نشانہ بنایا ہے؛ لیکن فلسطین میں آبادی میں نہ صرف نمایاں اضافہ ہوا؛ بلکہ لڑکیوں کے مقابلہ میں لڑکوں کی پیدائش کی شرح زیادہ رہی۔ گویا جہاد کے لیے انسانی وسائل کی فراہمی میں کمی واقع نہیں ہوئی۔ اس حقیقت کو سمجھتے ہوئے مغرب نے جو حکمت عملی نہ صرف ارض مقدس میں؛ بلکہ پورے عالم اسلام میں مسلم دانش وروں کے تعاون سے اختیار کی ہے وہ آبادی پر قابو پاتے ہوئے ترقی کی شرح کو کم سے کم رکھنے کی پالیسی ہے۔ مقام حیرت ہے کہ ایران جیسے ملک نے بھی اپنی شرح پیدائش کو قابو میں کرنے کی اعلیٰ مثال پیش کی ہے اور کل تک جہاں شرح پیدائش ۵ فیصد ہوا کرتی تھی اب ۲ فیصد پر آگئی ہے۔

مغربی تصور ترقی کا ایک لازمی جزو آبادی پر قابو کا فلسفہ ہے جس کے نتیجے میں یورپ امریکہ اور چین معمر افراد کی کثرت اور نوجوانوں کی قلت کا شکار ہورہے ہیں؛ لیکن بجائے اس مسئلہ کے فطری حل کی طرف جانے کے مغرب کی حکمت عملی یہ ہے کہ آبادی کے فطری دباؤ کو جو زیادہ آبادی کے خطوں سے کم آبادی کے خطوں کی طرف ہورہا ہے روکنے کے لیے بجائے اپنے گھر کو درست کرنے کے زیادہ آبادی کی شرح والے ممالک کو اپنی پیدائش میں کمی پر امداد کی رقوم دے کر آمادہ کیا جائے

تا کہ آبادی کا بہاؤان کی طرف نہ ہواوراس طرح وہ اپنے اقتدارکوزیادہ محفوظ و مستحکم کرسکیں۔

اگرآبادی کے حوالے سے یہ سازش کامیاب ہوتی ہےتو آئندہ ۳۰ سالوں میں مسلم فلسطین کی جگہ جزوی اکثریت والا خطہ وجود میں آجائے گا اور فلسطینی جو اقلیت نہ ہونے کے باوجود ظلم واور عصبیت کا شکار ہیں ایک اقلیت بن جانے کے بعد اپنے حقوق کی طرف تصور میں بھی دیکھنے کے قابل نہیں رہیں گے۔

مسلم دانش وروں کا فرض ہے کہ وہ عالمی طاقتوں کی حکمت عملی اور منصوبہ بندی سے شعوری آگاہی کے ساتھ خود اپنے مفادات کے تحفظ کے لیے متبادل حکمت عملی تجویز کریں اور مسلم دنیا کے مغرب زدہ فرماں رواؤں کو بار بار مستقبل کے خطرات اور مسائل سے متعارف کراتے ہوئے ان مسائل کے حل بالخصوص اپنی سیاسی حاکمیت کو مضبوط کرنے، مغرب کی ذہنی، مادی اور روحانی غلامی سے نجات حاصل کرنے اور دفاع اور معیشت میں بھی خودانحصاری کے حصول کی طرف متوجہ کریں۔

ایک طاقتور مسلم دنیا ہی مسلمانوں کے حقوق کا تحفظ کرسکتی ہے۔ جب تک مسلم دنیا کاسہ گدائی ہاتھ میں لیے اپنے دفاع، اپنی سیاسی آزادی، اپنے تعلیمی نظام، اپنے قانون حتیٰ کہ اپنی زبان وثقافت کے لیے بھی مغربی سامراج کی مرہون منت ہوگی دستوری طور پر آزاد ہونے کے باوجود ایسے ممالک اپنے مفادات کا تحفظ نہیں کرسکیں گے۔

فلسطین کی آزادی اور وہاں پر اسلامی معاشرے کے ساتھ اسلامی سیاسی حاکمیت کا قیام نہ صرف فلسطینیوں کے دل ودماغ کا مطالبہ ہے؛ بلکہ ایک عالمی انسانی ضرورت ہے۔ اگرامن عالم ایک ضرورت ہےتو اس کا وجود اسی وقت ہوگا جب فلسطین، کشمیر، میانمار اور دیگر مقامات کی تحریکات حریت کو تقویت پہنچا کر کامیاب کیا جائے؛ تا کہ وہ نزاعات، ظلم اور زیادتیاں ختم ہوں جو آخر کار سیاسی، معاشی اور اخلاقی مسائل کا اصل سبب قرار پاتی ہیں۔ یہ ایک عالمی مسئلہ ہے اور اسے صرف فلسطینی عوام کے آزادانہ حق خودارادیت کی بنیاد پر ہی حل کیا جاسکتا ہے۔ یہی صورت حال مقبوضہ کشمیر کی ہے خطے کا امن وسکون اس بات سے وابستہ ہے کہ مقبوضہ کشمیر میں ریاستی دہشت گردی ختم ہواور اہل کشمیر کو آزادانہ طور پر انتخابات کے ذریعہ اپنی قسمت کا فیصلہ کرنے کا حق دیا جائے۔

گویا محض مذاکرات مسئلہ کا حل نہیں ہوسکتے مظلوم افراد کو حق خودارادیت دینے اور ان کی آزاد ریاست کے قیام کے بغیر مسئلے کا حل ممکن نہیں۔

* * *

فلسطین اور اسرائیل جنگ کی مکمل ہسٹری

اپنوں اور بیگانوں کی کرم نوازیوں کی داستان ہوشربا

تحریر: سفیان علی فاروقی، قطر

اس وقت پوری دنیا میں ایک ہی موضوع زیر بحث ہے اور وہ ہے مسئلہ فلسطین اور فلسطینی عوام ہی نہی بلکہ پوری دنیا پریشان ہے کہ یہ قضیہ مزید کتنی جانیں لے گا اور یہ خطہ چند ایک لوگوں کی خواہشات کے نظر مزید کتنی دیر تک ہوتا رہے گا۔

آج میں آپ کے لیے کافی ریسرچ کے بعد اس جاری جنگ کے حقائق۔ ماضی، حال، مستقبل اور فلسطین اسرائیل وار کی مکمل ہسٹری، اس جنگ میں اپنوں اور بیگانوں کا کردار اور بے شمار چھپے ہوئے پہلوؤں کی عقدہ کشائی کرنے جارہا ہوں تا کہ ایک مکمل منظر نامہ اس حوالے سے آپ کی نظر میں ہو اور آپ کو علم ہو کہ فلسطین کے قضیئے کو لے کر پچھلی کئی دہائیوں سے کیا چلتا رہا؛ تا کہ موجودہ صورتحال سمجھنے اور اس کا نتیجہ نکالنے میں آسانی ہو۔

مسلم ممالک کی عوام یعنی امت مسلمہ پچھلی دو تین صدیوں سے عموماً اور ایک صدی سے خصوصاً اپنوں اور بیگانوں کے مشق ستم کا شکار ہے، میری ناقص رائے کے مطابق اگر مسلم حکمران اپنے اقتدار یا خواہشات کی خاطر اپنی ہی رعایا کو فتح کرنے اور ایک دوسرے کو تاراج کرنے کی بجائے ایک مشترکہ بنک، ایک متحد فوج، مسلم ممالک میں ایک ہی کرنسی اور آپس میں ٹریڈنگ یونٹ بناتے ایک دوسرے کے لیے ویزہ پالیسی آسان کرنے کی طرف توجہ مبذول کرتے تو شاید ہماری یونٹی ختم نہ ہوتی اور کسی بھی غیر مسلم طاقت کو کسی بھی مسلم ملک میں طاقت کا مظاہرہ کرنے کی جرأت نہ ہوتی یا مسلمانوں کا قتل عام کرنے کی جرأت نہ ہوتی۔

یعنی اسرائیل اور فلسطین کی حالیہ جنگ پر بات شروع کرنے اور دشمن کو کوسنے سے پہلے اگر

اپنوں کی کرم نوازیوں، امت مسلمہ پر اپنوں کی مہربانیوں پر دلی افسوس نہ کیا جائے تو ممکن ہے کہ بات ادھوری رہ جائے۔

کمال اتاترک کی ریشہ دوانیاں، مصر میں محمد مرسی کی حکومت کا خاتمہ اور اخوان کے ہزاروں کارکنان کا قتل، جمال عبدالناصر کے ظلم وستم، پاکستان میں پرویز مشرف کے دور اقتدار میں اسلام پسندوں کا قتل عام اور پچھلی کئی دہائیوں سے جاری در پردہ اقتدار کی کشاکش میں خوار ہوتے پاکستانی عوام اور غیر مستحکم پاکستان کے پوری امت مسلمہ میں منفی اثرات۔ عراق، ایران اور کویت کی بے فائدہ و بے نتیجہ جنگ۔ شام میں حافظ الاسد اور بشار الاسد کا اقتدار کی لالچ میں شام کو میدان جنگ بنانا۔ ایران میں خمینی انقلاب کے نام پر قتل عام اور ایک مخصوص طبقے کا تسلط۔ فلسطین کے قضیے میں ترکی کی اسرائیل کے ساتھ ٹریڈنگ اور سعودی عرب کا اسرائیل کے ساتھ نرم رویہ، کس کس کا رونا رویا جائے بدقسمتی سے ہماری نااتفاقی نے جو بے یقینی کی صورتحال امت مسلمہ پر طاری کی اور اس کے نتیجے میں جو دشمنان اسلام کو فائدہ ہوا وہ تاریخ کا ایک تاریک ترین باب ہے۔

فلسطین اور اسلامک ہسٹری

دوستو! اسلام کی ابتدائی تاریخ میں مسجد اقصی مسلمانوں کا قبلہ اول رہا ہے اور نبی کریم ﷺ نے ۱۷یا۱۸ ماہ بیت المقدس کی طرف رخ کر کے نماز ادا کی ہے، اسلامک ہسٹری کا مشہور واقعہ معراج میں بھی بیت المقدس کو مرکزی حیثیت حاصل ہے، اس کے ساتھ ساتھ اسلامک ہسٹری یعنی ساڑھے چودہ سو سال میں نوے سال نکال کر ۱۲۰۰ سال مسجد اقصی مسلمانوں ہی کے پاس رہی، مسلمانوں نے ۱۵ھ ہجری (۶۳۶ء) میں اس کو فتح کیا پھر ایک مختصر وقفہ کے لیے یہ صلیبیوں کے قبضہ میں چلی گئی اور صلیبیوں نے (۱۰۹۹-۴۹۲ھ) میں اس پر قبضہ کیا اور ۹۰ سال کے لیے یہ مسلمانوں کے ہاتھ سے نکل گئی؛ لیکن پھر مسلمانوں کے عظیم سپاہ سالار سلطان صلاح الدین ایوبیؒ نے اسے ۱۱۸۷ء-۵۸۳ھ) میں واپس لے لیا اس کے بعد ۱۹۴۸ء میں یہ مسلمانوں کے ہاتھ سے ایک مرتبہ پھر نکل گئی۔

سلطنت عثمانیہ کا خاتمہ دراصل اسرائیل کی بنیاد کی طرف پہلا قدم تھا

جس طرح سلطان عماد الدین زنگیؒ (۱۱۷۰ء)، سلطان نورالدین زنگیؒ (۱۱۷۴ء) اور سلطان صلاح الدین ایوبیؒ (۱۱۹۳ء) کو مصر کی فاطمی حکومت جو کہ صلیبیوں کی آلہ کار تھی نے

پریشان کیے رکھا؛ بلکہ صلیبیوں کی سازشوں کا بہترین ذریعہ بنی رہی اسی طرح برصغیر میں ایران کی صفوی حکومت نے عالم اسلام کی اکائی اور اتحاد کی علامت ''سلطنت عثمانیہ'' کو پریشان کرنا شروع کردیا؛ بلکہ عثمانی حکومت سے باقاعدہ جنگیں شروع کردیں اور دشمن نے اس موقع سے بھرپور فائدہ اٹھایا اور نپولین نے ۱۷۹۸ء میں مصر پر حملہ کردیا، فرانس نے ۱۸۳۰ء میں الجزائر پر قبضہ کرلیا، انگلینڈ نے ۱۸۳۸ء میں عدن پر قبضہ کرلیا، فرانس نے ۱۸۸۱ء میں تیونس پر قبضہ کرلیا، انگلینڈ نے ۱۸۸۲ء میں مصر پر قبضہ کرلیا، اٹلی نے ۱۹۱۱ء میں لیبیا پر قبضہ کرلیا، فرانس نے ۱۹۱۱ء میں مراکش پر قبضہ کرلیا، ۱۹۱۷ء میں انگلینڈ نے عراق پر قبضہ کرلیا یوں سلطنت عثمانیہ کو سازش کے تحت کمزور کرکے اور پھر ختم کرکے پورے عالم اسلام کو ٹکڑے ٹکڑے کردیا گیا اسی کے نتیجہ میں ۱۹۱۷ء میں ایک ''معاہدہ بفور'' ہوا جس کی صورت میں صہیونی مغربی اتحاد وجود میں آیا پھر ۱۹۱۸ء میں اس خطے کا تقریباً مکمل کنٹرول برطانیہ کے پاس چلا گیا اور ۱۹۲۲ء اقوام متحدہ نے بھی اس کنٹرول کو باقاعدہ تسلیم کرلیا اور اسی سال (ہربرٹ صموئیل) متشدد یہودی کو فسلطین میں برطانیہ کی طرف سے پہلا مندوب تعینات کردیا گیا۔ ۱۹۴۸ء میں اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی میں فلسطین کو عربوں اور یہودیوں میں تقسیم کرنے کا رزولوشن پاس ہوا اس طرح ناجائز ریاست اسرائیل کی بنیاد پڑی اور عرب آبادی کے سینہ پر اسرائیل کا خنجر پیوست کردیا گیا۔

دوستو! برطانوی تسلط (۱۹۱۸ء تا ۱۹۴۸ء) کے دوران یہودیوں کی آبادکاری کا سلسلہ بالجبر برطانیہ کی زیرسایہ شروع ہوا جو ۱۹۴۸ء تک چھ لاکھ چھیاسی ہزار تک پہنچ گیا اور اس سلسلہ میں برطانیہ نے جبراً غیر فلسطینی کاشتکاروں کی اراضی، اپنی غصب کردہ اراضی اور ثقافت اسلامیہ کی اراضی جو صدیوں سے اسلامی مقاصد کے لیے وقف تھی یہودیوں کو دینا شروع کی یوں برطانیہ کے زور بازو پر ۲۹۲ اسرائیلی کالونیاں بن چکی تھیں اور برطانیہ ہی کی شہ پر اسرائیل کے باقاعدہ اعلان سے پہلے ستر ہزار عسکری جنگجوؤں کی فوج بھی تیار کی جاچکی تھی، یعنی اسرائیل کی بنیاد ۱۹۴۸ء مسلمانوں کی تقریباً چار سو بستیوں کو مسمار اور تقریباً ۲۵ ہزار فلسطینیوں کا قتل عام کرکے اس کی ناجائز آبادکاری سے ہوئی، یوں ۱۴ رمئی ۱۹۴۸ء کی ایک المناک شام کو یہودیوں نے باقاعدہ اسرائیل کا اعلان کردیا اور پھر ۱۹۶۷ء تک مکمل طور پر بیت المقدس پر اسرائیل قابض ہوچکا تھا یوں حالیہ تنازع سے پہلے تک تقریباً ۵۶ لاکھ فلسطینی اپنے گھروں سے محروم کرکے پناہ گزین اور مہاجرت کی زندگی گزارنے پر مجبور کردیے گئے۔

حیران کن واقعہ

۱۹۴۵ء سے ۱۹۴۸ء کے دوران ایک اور حیران کن واقعہ پیش آیا کہ سعودی عرب نے اپنی فلسطین کے ساتھ لگنے والی سرحد نہایت خاموشی سے مملکت اردن کو دیدی یوں سعودی عرب نے براہ راست فلسطین کی ہمسائیگی کو بالقصد ترک کردیا جس کے متعلق مختلف مثبت اور منفی رائے قائم کی جاتی رہی ہیں۔

اسی دوران ۱۹۶۷ء کو عرب اسرائیل جنگ ہوئی جس میں عرب ممالک کے تقریباً دس ہزار فوجی شہید ہوئے اور پھر اسرائیل نے مصر، شام، لبنان اور اردن کے وسیع علاقوں پر قبضہ کرلیا اس طرح ۲۰۸۷۰ مربع میل کے علاقے پر یہودیوں نے ناجائز قبضہ کرلیا جن میں سے کچھ علاقے بعد میں واپس بھی ہوئے لیکن بہت کم۔

یہودیوں کا نعرہ کہ فلسطین ان کا وطن ہے؟

یہودیوں کا جو بنیادی نعرہ ہے کہ فلسطین ان کا وطن ہے وہ بھی بے بنیاد ہے کیونکہ معاصر یہودیوں میں سے ۹۰ فیصد سے زائد یہودیوں کا تاریخی اعتبار سے فلسطین کے ساتھ کوئی تعلق نہیں ہے اور معاصر یہودیوں کا تعلق (الخزر اور اشکنار) قبائل سے ہے جو کہ تاتاری یعنی قدیم ترک قبائل ہیں اور اگر ان کو اپنے وطن واپس لوٹنے کا کوئی حق حاصل ہے بھی تو وہ روس کے جنوبی علاقوں میں ہے نا کہ فلسطین میں۔ اسی طرح سابقہ ادوار میں بھی یہودیوں نے کئی مرتبہ بالقصد ارض مقدس فلسطین میں آنے اور بسنے سے انکار کردیا تھا جیسے حضرت موسیٰؑ کے ساتھ فلسطین کی جانب جانے سے ان کی اکثریت نے انکار کردیا اور بعد کے زمانہ میں جب ایرانی بادشاہ (قورش ثانی) نے انھیں دوبارہ فلسطین میں بسانے کی پیشکش کی تو ان کی اکثریت نے بابل (عراق) سے واپس جانے سے انکار کردیا تھا اور یہ جو موجودہ فلسطینی ہیں یہ ان کنعانیوں کی نسل سے ہیں جن کی وجہ سے اس علاقے کا قدیمی نام ارض کنعان پڑا تھا۔

اس جنگ کا ایک اور المیہ

اسرائیل کو فریق کے طور پر سب سے پہلے مصر نے ۱۹۷۸ء میں تسلیم کیا اور اس سے معاہدہ کیا

جسے (کیمپ ڈیوڈ معاہدہ) کہا جاتا ہے (میرے خیال میں اس معاہدے نے اسرائیل کے لیے ایک ریاست کے طور پر مضبوط کرنے کی بنیاد رکھ دی تھی) جس میں دو بنیادی شقیں ملاحظہ کریں:

۱- مصر اور اسرائیل کے درمیان ڈپلومیٹک نمائندگی کا تبادلہ۔

۲- دونوں ملکوں کے درمیان اقتصادی مقاطعہ اور جنگی صورتحال کا خاتمہ۔

اس کے بعد ایک طرف تو اکتوبر ۱۹۹۱ء میں تحریک آزادی فلسطین اور عرب ممالک نے میڈرڈ شہر میں اسرائیل کے ساتھ بلاواسطہ امن مذاکرات کے سلسلے کا آغاز کیا جو دو برس تک بغیر کسی نتیجے کے چلتا رہا؛ لیکن درپردہ مذاکرات بھی اسرائیل نے شروع کردیئے جو (اوسلو) معاہدے کی بنیاد بنے جس پر عرب نمائندوں اور اسرائیل نے ۱۳ر ستمبر ۱۹۹۲ء میں دستخط کردیئے۔ جس میں بدقسمتی سے عرب کی ایک مخصوص قیادت نے (سارے عرب اس میں شامل نہیں تھے) اسرائیل کو ایک جائز ملک تسلیم کرلیا، فلسطینی اراضی کے ۷۷ فیصد حصے پر بھی اسرائیلی تسلط جائز اور تسلیم کرلیا اور یہ بھی طے پایا کہ تحریک انتفاضہ اب کالعدم ہوچکی ہے اور اسرائیل کے خلاف مسلح کاروائی اب غیر قانونی سمجھی جائے گی، یوں عرب قیادت فلسطینی عوام کے مطالبے سے دستبردار ہوگئی؛ لیکن اس معاہدے کو پورے عالم اسلام خصوصاً عرب ممالک میں شدید مخالفت کا سامنا کرنا پڑا اور عالم اسلام کے علماء نے باقاعدہ فتوے جاری کیے کہ فلسطین کی سرزمین کا فیصلہ کرنا کسی کا بھی حق نہیں ہے خصوصاً غیر فلسطین، اگر موجودہ وقت میں امت کی حالت کمزور ہے تو اس کا مطلب یہ نہیں کے طاقت کے آگے سر جھکا دیا جائے اور یہ کہ مزاحمتی تحریکیں اپنے حجم کے لحاظ سے جاری رہیں گی یہاں تک کہ اللہ تعالی حق کو غالب کردیں (اوسلو معاہدے میں فلسطین کے بنیادی ایشوز کو ڈسکس ہی نہیں کیا گیا تھا مثلاً ''القدس'' شہر کا مستقبل کیا ہوگا؟ فلسطینی مہاجرین کا مستقبل کیا ہوگا؟، مغربی پٹی اور غزہ کے علاقے میں غاصب صہیونی بستیوں کا کیا ہوگا؟ وغیرہ وغیرہ) ساتھ ساتھ یہ بھی اس بھیانک معاہدے میں طے پایا کہ فلسطینی اتھارٹی اسرائیلی حکومت کی نگرانی میں کام کرے گی، فلسطینی اتھارٹی فوج نہیں رکھ سکتی، اسرائیل فلسطینی اتھارٹی کے کسی بھی فیصلے کو ویٹو کرسکتا ہے، فلسطینی اتھارٹی اسرائیل کی اجازت کے بغیر اسلحے کی خرید و فروخت نہیں کرسکتی، اسرائیل کے خلاف مزاحمت کاروں کو گرفتار کرکے اسرائیلی حکومت کے سپرد کرنا بھی اوسلو معاہدے میں شامل تھا، اسی کے ساتھ اوسلو معاہدے میں یہ بھی ظلم کیا گیا کہ فلسطینی اتھارٹی کا سرحدات پر اختیار بالکل ختم کردیا گیا اور فلسطینی اپنی سرزمین میں آنے اور جانے کے لیے اسرائیل کی اجازت کے پابند ہوگئے، ایک اور خطرناک چیز اس معاہدے میں یہ ہوئی کہ اب آزادانہ طور پر

کوئی بھی عرب ملک اسرائیل کی حیثیت کو تسلیم کرسکتا تھا۔

یہودیوں کے ابتداً دو گروہ تھے

سارے یہودی فلسطین پر غاصبانہ قبضے کے حق میں نہیں ہیں؛ بلکہ اس عنوان پر ان کے بھی دو گروہ ہیں ایک بالکل لبرل بن کر زندگی گزارنا چاہتے ہیں اور دوسرے دنیا سے الگ تھلگ متشدد بن کر اور یہی متشدد طبقہ فلسطین پر ناجائز قبضہ کرنے کے مکروہ چکروں میں ہے اور امریکہ کا سپورٹ ان کے لیے کیوں ہے اس میں ایک نقطہ نظر یہ بھی ہے کہ یورپ ان متشدد یہودیوں سے جان چھڑانا چاہتا ہے تاکہ یورپ کو ان کی ریشہ دوانیوں سے محفوظ رکھا جاسکے اسی لیے وہ ان کی ہر ممکنہ سپورٹ کررہا ہے۔

دوستو! یہ تھی اس اسرائیل اور فلسطین قضیئے کی مکمل ہسٹری امید ہے کہ اب موجودہ حالات کا سمجھنا آپ سب کے لیے مشکل نہ ہوگا اور اس وقت جو سب سے اہم چیز ہے وہ فلسطینی بہن بھائیوں سے اظہار یکجہتی کرنا، ان کی ہر ممکنہ مدد کرنا، غذا، اور ادویات کی فراہمی اور اسرائیلی مصنوعات کا بائیکاٹ یہ وہ اہم اور ضروری چیزیں ہیں جو ہم مسلم ممالک کے مجبور عوام کرسکتے ہیں اور اس میں کوئی روک ٹوک نہیں ویسے تو حق یہ ہے کہ اپنی اپنی حکومتوں سے پرزور مطالبہ کیا جائے کہ وہ اس جنگ کو رکوانے اور فلسطینی عوام کو ان کا جائز حق دلوانے کے لیے اپنے وسائل کو بھرپور طریقے سے بروئے کار لائے۔

* * *

غزہ: ''تہذیبوں کے چوراہے'' کی تاریخ

از: سجاد اظہر

اپنی مثالی اسٹریٹیجک حیثیت کی وجہ سے غزہ کا علاقہ کئی بار تباہ ہوا اور کئی بار آباد ہوا۔ چار ہزار سال پر محیط اس کی معلوم تاریخ کو دیکھا جائے تو بجا طور پر یہ کہا جاسکتا ہے کہ غزہ کے رہنے والوں کو موت کے منہ میں جینے کا ہنر وراثت میں ملا ہے۔

ذرا غزہ کی پٹی کے جغرافیے پر ایک نظر دوڑائیے: اس کے مغرب میں بحیرۂ روم، جنوب مغرب میں صحرائے سینا، مشرق میں شام، جب کہ شمال مشرق میں بیت المقدس واقع ہیں۔ اس مختصر سی پٹی کا ۱۱ کلومیٹر کا علاقہ مصر سے ملتا ہے۔

تہذیبوں کا چوراہا

یہی جغرافیائی مرکزیت ہے جس کی وجہ سے کئی طالع آزما جرنیلوں، دلیر سلطانوں، الوالعزم بادشاہوں اور باہمت امیروں نے یہاں کی مٹی پر جنگیں لڑی ہیں، یہ علاقہ کئی بار تاراج ہوا، پھر تعمیر ہوا، پھر جلایا گیا۔ اس علاقے کی مٹی کھودی جائے تو اس میں تہہ بہ تہہ تاریخ کی اَن گنت کہانیاں چھپی ہوئی ملیں گی۔ یہی وجہ ہے کہ یہ چھوٹی سی پٹی تہذیبوں کا چوراہا کہی جاسکتی ہے؛ کیوں کہ یہاں سے ایشیا، افریقہ اور یورپ کو آپس میں ملانے والے اہم سمندری اور زمینی راستے گزرتے ہیں۔ غزہ کے موجودہ باسی اسی تاریخی سرزمین کے باثروت ورثے کے مالک ہیں اور اسی زمین پر وہ آج کل زندگی اور موت کی کشمکش میں مبتلا ہیں۔

اس سرزمین پر پہلی آبادی کے آثار پتھر کے زمانے تک جاتے ہیں۔ یہاں کئی سلطنتوں کا جھنڈا لہرایا اور اتارا گیا۔ کنعانی باشندوں کا یہ شہر قدیم مصری شہنشاہوں کی سلطنت کا حصہ رہا پھر ۳۰۷ ق م میں

یہ اشوری سلطنت کا حصہ بن گیا، جو چودھویں سے ساتویں صدی ق م تک دنیا کی عظیم سلطنت رہی ہے۔

۳۳۲ق م میں غزہ کو سکندرِاعظم نے فتح کیا، بعد میں یہ خطہ رومیوں کی دسترس میں آ گیا جس کے دوران عرب بیدونی یہاں آ کر آباد ہونا شروع ہوئے۔ ۹۶ق م میں ہاسمونین سلطنت نے غزہ کو تاراج کر دیا، جس کے بعد رومیوں نے اس کی تعمیرِ نو کی اور یہاں خوشحالی کا دور دورہ شروع ہوا۔

شہر کا انتظام وانصرام چلانے کے لیے شہر کے باسیوں جن میں یونانی، رومی، یہودی، مصری، ایرانی اور عرب شامل تھے، پر مشتمل ایک سینیٹ بنائی گئی۔ پھر جب سینٹ فارفائرس کے دور میں شہر مسیحی بن گیا تو اس نے یہاں پر قائم آٹھ قدیم مندر مسمار کر دیے۔

۶۳۷ میں غزہ کو مسلم جرنیل عمرو بن العاص نے فتح کیا اور غزہ کی زیادہ تر آبادی نے اسلام قبول کر لیا۔ بعدازاں غزہ کی تاریخ میں کئی نشیب وفراز آئے۔ فاطمیوں کے دور میں صلیبیوں نے غزہ کو مسلمانوں سے چھین لیا؛ تاہم سلطان صلاح الدین ایوبی نے یہ قبضہ واپس لے لیا۔ تیرہویں صدی تک یہاں مملوک بادشاہوں کا پرچم لہرایا، پھر سولہویں صدی میں یہ سلطنت عثمانیہ کا حصہ بن گیا۔

پہلی جنگ عظیم کے دوران جب برطانوی فوجوں نے فلسطین فتح کیا تو غزہ بھی ان کے کنٹرول میں چلا گیا۔ ۱۹۴۸ء میں پہلی عرب اسرائیل جنگ کے دوران غزہ کی آبادی کا بڑا حصہ مہاجر بن کر شہر چھوڑنے پر مجبور ہو گیا۔ ۱۹۴۹ء سے ۱۹۶۷ء تک یہاں مصر کی عمل داری رہی۔ اس کے بعد عرب اسرائیل جنگ کے نتیجے میں اسرائیل نے غزہ پر قبضہ کر لیا جو ۱۹۹۴ء تک برقرار رہا۔ اوسلو معاہدے کے تحت اسرائیل نے غزہ کی پٹی فلسطینی اتھارٹی کے حوالے کر دی۔

غزہ بیسویں صدی میں

گذشتہ ایک سو سال میں غزہ کا کنٹرول پانچ حکومتوں کے پاس رہ چکا ہے۔ پہلے سلطنت عثمانیہ، پھر برطانیہ، مصر اور اسرائیل اس کے حکمران رہے ہیں، جب کہ اب یہ علاقہ خود فلسطینیوں کی عمل داری میں ہے۔ ۱۵رمئی ۱۹۴۸ء کو جب برطانوی افواج جاتے جاتے اقتدار اسرائیل کے حوالے کر گئیں تو اس کے اگلے ہی روز شام، لبنان، اردن اور مصر نے اسرائیل کے خلاف جنگ شروع کر دی۔ غزہ چونکہ مصری سرحد پر واقع تھا؛ اس لیے یہ مصری فوج کا اڈا بن گیا جہاں سے مصری فوجیں اسرائیل کے زیرِ قبضہ علاقوں پر حملے کر سکتی تھیں۔ بحیرہ روم کے ساتھ غزہ کے شمال میں اسرائیلی افواج نے مصری فوج کی پیش قدمی روک دی؛ مگر مصری فوجیں بحیرہ روم کے ساتھ ۴۰ کلومیٹر کے علاقے میں اپنا قبضہ

برقرار رکھنے میں کامیاب رہیں جو بعد میں جنگ بندی کے بعد بھی قائم رہا۔

پہلی عرب اسرائیل جنگ کے نتیجے میں سات سے آٹھ لاکھ فلسطینی مہاجر بن کر اپنا گھر بار چھوڑنے پر مجبور ہوئے ان میں سے زیادہ تر کا ٹھکانہ غزہ بنا۔ آج بھی غزہ میں ان مہاجرین کے آٹھ کیمپ موجود ہیں جہاں چھ لاکھ سے زیادہ فلسطینی مہاجرین رہتے ہیں۔ ان کیمپوں میں رہنے والے ۸۱؍فیصد مہاجرین خط غربت سے نیچے زندگی گزار رہے ہیں جنہیں بنیادی ضروریات زندگی بھی دستیاب نہیں ہیں۔

غزہ میں رہنے والے دس لاکھ لوگوں کو اقوام متحدہ روزانہ کی بنیادوں پر راشن فراہم کرتا ہے۔ ۲۳؍لاکھ سے زائد آبادی والے اس شہر پر ''حماس'' کی حکمرانی ہے۔

غزہ میں حماس کا قیام

۱۹۶۷ء میں جب نہر سویز کے مسئلے پر مصر اور اسرائیل کی جنگ چھڑی تو اس کے نتیجے میں اسرائیل نے مصر کے زیر قبضہ غزہ کی پٹی اور صحرائے سینا کے علاقوں پر اپنا کنٹرول قائم کرلیا۔ اس کے ساتھ شامی علاقے گولان کی پہاڑیوں اور اردن سے مشرقی بیت المقدس کا علاقہ بھی چھین لیا۔

اس چھ روزہ جنگ میں ایک لاکھ فلسطینیوں کو مہاجر بننا پڑا، جس کے نتیجے میں فلسطینی یہ سوچنے پر مجبور ہوگئے کہ انھیں اپنی آزادی کی جنگ خود ہی لڑنا پڑے گی، جس کے نتیجے میں پی ایل او (جو ۱۹۶۴ء میں قائم ہوچکی تھی) کی پذیرائی میں اضافہ ہوگیا۔

۱۹۷۳ء کی عرب اسرائیل جنگ، ۱۹۸۷ء اور ۲۰۰۰ء میں فلسطینیوں کی تحریک مزاحمت جسے ''انتفاضہ'' کا نام دیا جاتا ہے، کا نتیجہ یہ نکلا کہ ۱۹۸۷ء میں غزہ میں ''حماس'' کا قیام عمل میں آیا۔

۱۹۹۰ء میں اوسلو معاہدے کی روشنی میں اسرائیل اور پی ایل او ایک آزاد فلسطینی ریاست کے قیام پر متفق ہوگئے۔ اسی معاہدے کی رو سے ۱۹۹۴ء میں فلسطینی اتھارٹی کا قیام عمل میں آیا۔ پی ایل او اس معاہدے کے بعد تشدد کا راستہ ترک کرنے پر آمادہ ہوگئی؛ تاکہ ایک آزاد فلسطینی ریاست کی جانب بڑھا جاسکے۔

دوسری جانب ''حماس'' اور ''اسلامک جہاد'' نامی فلسطینی تنظیموں کا موقف ہے کہ فلسطینی ریاست کے قیام کا مقصد مسلح جدوجہد ہی سے ممکن ہے، جس کی وجہ سے حماس کو کئی ممالک نے دہشت گرد قرار دیا ہے۔

یاسر عرفات جو فلسطینی نیشنل اتھارٹی کے صدر تھے، کے ۲۰۰۴ء میں انتقال سے فلسطین میں سیاسی خلا پیدا ہوگیا، جس کا فائدہ حماس کو ہوا۔

اسرائیل نے ۲۰۰۵ء میں غزہ سے اپنی فوجوں کو واپس بلا لیا اور غزہ میں نو ہزار کے قریب اسرائیلی آبادکاروں کو بھی حکم دیا کہ وہ غزہ خالی کردیں۔

دنیا کی سب سے بڑی کھلی جیل

غزہ میں پانی اور بجلی کی فراہمی، ٹیلی کمیونیکیشن اور ساحل سمندر پر اسرائیل کا ہی کنٹرول رہا۔ حماس نے ۲۰۰۶ء کے انتخابات میں مہم چلائی کہ اوسلو معاہدہ ایک آزاد فلسطینی ریاست کے قیام میں ناکام ہوگیا ہے جس پر اس نے فتح تنظیم کو عام انتخابات میں شکست سے دوچار کردیا۔

فلسطینی سکیورٹی فورسز کو غزہ میں غیر موثر کر کے حماس نے اقتدار سنبھال لیا۔ اسرائیل نے حماس کی جانب سے کنٹرول سنبھالنے کے بعد غزہ کا محاصرہ کرلیا؛ تاکہ حماس اسلحہ وغیرہ جمع نہ کرسکے۔

یہ محاصرہ آج تک جاری ہے اور ہیومن رائٹس واچ غزہ کو دنیا کی سب سے بڑی کھلی جیل قرار دیتی ہے۔

❊ ❊ ❊

فلسطین پر اسرائیلی قبضے کی مختصر تاریخ

فلسطین کی سرزمین ایک صدی سے پہلے سلطنت عثمانیہ کا حصہ تھی۔ پہلی جنگ عظیم کے دوران، جیسے ہی سلطنت زوال پذیر ہوئی، ترکی ایک جمہوری ملک بن گیا اور فلسطین پر برطانیہ نے قبضہ کرلیا۔ ۱۹۱۷ء میں برطانیہ نے، برطانوی وزیر خارجہ آرتھر جیمز بالفور کی طرف سے لیونل والٹر روتھ شائلڈ کو لکھے گئے خط میں، اسرائیل کے لیے راہ ہموار کرتے ہوئے، فلسطین میں ''یہودیوں کے لیے قومی سرزمین'' کے لیے حمایت کا اظہار کیا۔ ''بالفور اعلامیہ''، جس کی اب بھی اہمیت ہے، نے یہ کہتے ہوئے عربوں کے تحفظ کا بھی مطالبہ کیا کہ ''ایسا کچھ نہیں کیا جائے گا جس سے موجودہ غیر یہودی برادریوں کے شہری اور مذہبی حقوق کو نقصان پہنچے''، پھر بھی اس میں ان کے سیاسی یا قومی حقوق کا ذکر نہیں کیا گیا۔ جب فلسطین پر برطانوی منشور شروع ہوا تو یہودیوں کی آبادی کم تھی۔ برطانوی الاونس کے تحت یورپی یہودیوں کی ہجرت کے ساتھ، ۱۹۲۲ء سے ۱۹۳۵ء کے درمیان آبادی بڑھ کر ۲۷؍ہوگئی۔

اسرائیل کا قیام

''دوسری جنگ عظیم'' کے دوران ہولوکاسٹ (۱۹۴۰ء کی دہائی میں نازی حکومت نے یورپ میں یہودیوں کا قتل عام شروع کیا تھا) یہودیوں کے لیے ایک بڑا سبب بن گیا کہ وہ بڑے پیمانے پر فلسطین کی طرف ہجرت کریں۔ اس دوران یہ حقیقت بھی نظر انداز کردی گئی کہ ۱۹۳۹ء میں برطانوی حکومت کی ایک دستاویز میں کہا گیا تھا کہ فلسطین میں سالانہ ۱۰؍ہزار افراد ہی ہجرت کرسکیں گے۔ اس میں ہنگامی حالات کو استثنیٰ حاصل تھا۔

دوسری عالمی جنگ کے بعد ۲۷؍نومبر ۱۹۴۷ء کو اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی نے ایک قرارداد پاس کرکے فلسطین کو عربوں اور یہودیوں کے درمیان تقسیم کرنے کا فیصلہ کیا اور اسرائیل کا قیام عمل میں آیا۔

نیویارک ٹائمز نے اس وقت لکھا تھا کہ: ''عرب مندوبین کا واک آوٹ اس واضح اشارے

کے طور پر کیا گیا تھا کہ فلسطینی عربوں کا اسمبلی کے فیصلے سے کوئی تعلق نہیں ہوگا۔''

اسرائیل کی وزارت خارجہ نے نوٹ کیا کہ ''۱۴رمئی ۱۹۴۸ء کو، جس دن فلسطین پر برطانوی منشور کی میعاد ختم ہوئی، یہودی عوامی کونسل تل ابیب کے عجائب گھر میں جمع ہوئی اور ریاست کے قیام کا اعلان کرتے ہوئے، درج ذیل اعلان کی منظوری دی۔ اسرائیل؛ اس نئے ملک کو امریکہ نے اسی رات تسلیم کرلیا تھا؛ جب کہ سوویت یونین نے تین دن بعد۔

۱۹۴۸ء کی جنگ

اسرائیل کی بنیاد؛ اسرائیل اور پڑوسی عرب ممالک کے درمیان ایک بھرپور جنگ کا باعث بنی، جس میں اسرائیل فتح یاب ہوا، اور اس کا اختتام اس طرح ہوا کہ اقوام متحدہ کے ابتدائی منصوبے سے زیادہ زمین اس کے حصے میں آئی۔ فلسطینی اسے ''النقبہ'' کہتے ہیں جس کا مطلب ہے ''تباہی''؛ کیونکہ اسرائیل کی فتح فلسطینی کمیونٹی کے تقریباً ۷/لاکھ افراد کی نقل مکانی کا باعث بنی تھی۔

بی بی سی کی ایک رپورٹ کے مطابق ۱۹۴۹ء اور ۱۹۶۰ء کی دہائیوں کے درمیان، ۱۰/لاکھ تک یہودی پناہ گزین اور تارکین وطن کے ساتھ ہولوکاسٹ سے بچ جانے والے اضافی ڈھائی لاکھ افراد اسرائیل ہجرت کر گئے تھے۔

پی ایل او کی تشکیل

۱۹۵۹ء میں یاسر عرفات اور ان کے دوستوں نے اسرائیلی قبضے کے خلاف مزاحمت کے لیے ایک چھوٹے سے خلیجی ملک کویت میں فلسطینی مزاحمتی گروپ ''الفتح'' قائم کیا۔ ۱۹۶۴ء میں عرفات اور دیگر فلسطینی لیڈروں نے اسرائیل کے خلاف متحد مزاحمت قائم کرنے کے لیے فلسطین لبریشن آرگنائزیشن (پی ایل او) بنانے کے لیے افواج میں شامل ہونے کا فیصلہ کیا۔

عرب اسرائیل جنگ

۱۹۶۷ء میں اسرائیل اور مصر، اردن اور شام کے درمیان چھ روزہ جنگ چھڑ گئی۔ اسرائیل نے مشرقی یروشلم، مغربی کنارہ، غزہ، گولان کی پہاڑیوں اور سینائی پر قبضہ کرلیا۔ پیٹر آرمنصور، ہوور انسٹی ٹیوٹ کے لیے لکھتے ہوئے نوٹ کیا ہے کہ جب کہ گولان کی پہاڑیاں اور مغربی کنارے کا بیشتر حصہ اسرائیل کے کنٹرول میں ہے، اسرائیل نے ۱۹۷۸ء میں کیمپ ڈیوڈ معاہدے کے حصے کے طور پر جزیرہ نما سینائی مصر کو واپس کر دیا اور رضا کارانہ طور پر اسرائیلی بستیوں کو ۲۰۰۵ء میں غزہ میں ترک کر دیا۔

۱۹۷۳ء کی جنگ

۱۹۷۳ء میں ایک بار پھر جنگ ہوئی جسے ''اکتوبر عرب اسرائیل جنگ'' کہا جاتا ہے۔ مصر اور شام نے ''یوم کیپور'' کی مذہبی تعطیل (اُس سال ۶/اکتوبر) پر اسرائیل کے خلاف جنگ کی۔ دونوں فریقوں نے ماہ کے آخر میں جنگ بندی کے معاہدے کی کوشش کی اور امریکہ نے مذاکرات میں مدد کے لیے ہاتھ بڑھایا۔

یاسر عرفات کی اقوام متحدہ میں ''زیتون کی شاخ'' نامی تقریر

۱۳/نومبر ۱۹۷۴ء کو اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی سے خطاب میں پی ایل او کے اس وقت کے رہنما یاسر عرفات نے ''دہشت گرد'' کے لیبل کو مسترد کر دیا تھا (''ورنہ برطانوی استعمار سے آزادی کی جدوجہد میں امریکی عوام دہشت گرد ہوتے؛ یورپی مزاحمت کے خلاف نازی دہشت گرد ہوں گے'') اور اقوام متحدہ سے مشرق وسطیٰ میں امن کے عمل کو آسان بنانے میں مدد کی اپیل کی: ''آج مَیں ایک ہاتھ میں زیتون کی شاخ اور دوسرے میں آزادی پسندوں کی بندوق لیے آیا ہوں۔ مَیں دہراتا ہوں کہ زیتون کی شاخ کو میرے ہاتھ سے گرنے نہ دینا۔''

پہلا انتفاضہ

پہلا انتفاضہ (فلسطینی شورش) اس کے بعد شروع ہوئی جسے اسرائیلی ایک حادثہ کہتے ہیں اور فلسطینی اشتعال انگیزی۔ ۸/دسمبر ۱۹۸۷ء کو ایک اسرائیلی آبادکار نے جس کی شناخت ہرزل بوکیزا کے نام سے ہوئی، نے اسرائیل کے درمیان اریز/بیط چیک پوائنٹ سے گھر واپس آنے والے فلسطینی کارکنوں پر اپنی گاڑی چڑھا دی۔ غزہ میں جبلیہ اور مقفی میں چار کارکنان ایک دہشت گردانہ حملے میں مارے گئے۔'' اس کے بعد احتجاج اور تشدد پھوٹ پڑا جو ''اوسلو معاہدے'' پر دستخط ہونے کے بعد ختم ہوا۔

زیک بیوچیمپ نے ووکس کے لیے لکھتے ہوئے نوٹ کیا کہ ''پہلا انتفاضہ فلسطینیوں کے مظاہروں کا ایک بڑے پیمانے پر بے ساختہ سلسلہ تھا، غیر متشدد کارروائیاں جیسے بڑے پیمانے پر بائیکاٹ اور فلسطینیوں کا اسرائیل میں کام کرنے سے انکار اور اسرائیلیوں پر پتھروں سے حملے وغیرہ۔''

انسٹی ٹیوٹ فار مڈل ایسٹ انڈرسٹینڈنگ (آئی ایم ای یو) کے مطابق، مقبوضہ علاقوں میں انسانی حقوق کے لیے اسرائیلی انفارمیشن سینٹر کے اعداد و شمار کے مطابق پہلے انتفاضے میں فلسطینیوں کے ہاتھوں تقریباً ۱۵۰/اسرائیلی ہلاک ہوئے؛ جب کہ اسرائیلی افواج نے ایک ہزار سے زائد

فلسطینیوں کو شہید کیا۔

اوسلو معاہدہ

اکتوبر ۱۹۹۱ء میں اسپین نے میڈرڈ میں ایک امن کانفرنس کی میزبانی کی جس کی مشترکہ میزبانی امریکہ اور سوویت یونین نے کی۔ اس نے اسرائیل، لبنان، شام، اردن اور فلسطین کے نمائندوں کو اکٹھا کیا۔ ۱۹۹۲ء میں واشنگٹن اور ماسکو میں مذاکرات جاری رہے۔

جیسا کہ امریکی محکمہ خارجہ نوٹ کرتا ہے، ''۱۹۹۳ء تک، واشنگٹن مذاکرات تعطل کا شکار ہو چکے تھے اور اسرائیل فلسطین اور اسرائیل اردن کے خفیہ مذاکرات کے ذریعے ختم ہو گئے تھے، جس نے اسرائیلی فلسطینی اصولوں کا اعلامیہ (نام نہاد ''اوسلو معاہدہ'') تیار کیا۔ ستمبر ۱۹۹۳ء کا اور اکتوبر ۱۹۹۴ء کا اسرائیل اردن امن معاہدہ۔''

۱۹۹۳ء میں، اسرائیلی وزیر اعظم یتزاک رابن اور فلسطین لبریشن آرگنائزیشن (پی ایل او) کے رہنما یاسر عرفات نے اوسلو اعلامیہ پر دستخط کیے تھے۔ اگلے سال، عرفات نے فلسطینی نیشنل اتھاریٹی قائم کی جس کے تحت اسرائیل کو غزہ کے بیشتر حصے اور مغربی کنارے کے شہر جیریکو سے نکل جانا تھا۔

۱۹۹۴ء میں اردن اور اسرائیل نے اکتوبر میں امن معاہدے پر دستخط کیے؛ جب کہ دسمبر میں رابن، عرفات اور اسرائیلی ایف ایم شمعون پیریز مشترکہ نوبیل امن انعام یافتہ بن گئے۔

رابن کا قتل

یتزاک رابن کو ۱۹۹۵ء میں ایک اسرائیلی انتہا پسند نے قتل کر دیا جس کی وجہ سے پیریز وزیر اعظم بنے۔

نیویارکر میں ڈین ایفرون کی کتاب کا جائزہ لیتے ہوئے، ڈیکسٹر فلکنز لکھتے ہیں: ''جیسے ہی اوسلو کے عمل کا آغاز ہوا (رابن کے مستقبل کے قاتل یگل) عامر کا یقین پختہ ہو گیا کہ رابن اسرائیلیوں اور خاص طور پر آبادکاروں کو بیچ رہا ہے؛ اس نے ریلیاں نکالیں۔ مقبوضہ علاقوں نے معاہدوں کی مذمت کی؛ یہاں تک کہ اپنی ملیشیا شروع کرنے کی کوشش کی۔''

دوسرا انتفاضہ

دوسرا انتفاضہ ۲۰۰۰ء اور ۲۰۰۵ء کے درمیان ہوا جو پہلے سے زیادہ پرتشدد تھا۔ امن مذاکرات ٹوٹ چکے تھے اور اسرائیلی اور فلسطینی ایک دوسرے سے ہوشیار تھے۔ آئی ایم ای یو کے ڈیٹا کے مطابق

اس میں اسرائیل کے ہاتھوں ۴؍ہزار ۸۷۸ فلسطینی ہلاک ہوئے تھے؛ جب کہ فلسطین کے ہاتھوں ایک ہزار ۶۳؍اسرائیلی۔

اسرائیل کو امریکی مراعات

ستمبر۲۰۱۶ء میں امریکہ نے اسرائیل کے لیے ۳۸؍بلین ڈالر کے ۱۰؍سالہ فوجی امداد کے منصوبے پر دستخط کیے تھے۔ رائٹرز کے مطابق یہ امریکی تاریخ میں اس قسم کا سب سے بڑا معاہدہ ہے۔ ۲۰۱۷ء میں ڈونالڈ ٹرمپ نے فلسطینیوں اور ان کے حامیوں کو مایوس کرنے کے لیے یروشلم کو اسرائیل کا دارالحکومت تسلیم کرلیا۔ انھوں نے امریکی سفارت خانہ تل ابیب سے منتقل کرنے کا حکم دیا۔

مارچ ۲۰۱۸ء میں ٹرمپ نے ٹویٹ کیا: ''۵۲؍سال بعد اب وقت آ گیا ہے کہ امریکہ گولان کی پہاڑیوں پر اسرائیل کی خودمختاری کو مکمل طور پر تسلیم کرے، جو اسرائیل کی ریاستی اور علاقائی استحکام کے لیے اہمیت کی حامل ہے!'' جب کہ ترکی اور عالمی برادری نے اس کی مذمت کی۔ اسرائیل نے مقبوضہ زمین پر مزید غیرقانونی بستیاں تعمیر کیں اور ایک بستی کو ٹرمپ سے موسوم کردیا۔

ٹرمپ کی نام نہاد ''ڈیل آف دی سنچری''

اسرائیل فلسطین تنازع ۲۰۱۸ء میں جاری رہا۔ ۲۰۱۹ء میں، اسرائیل میں متعدد انتخابات ہوئے جن میں موجودہ بنجامن نیتن یاہو اور بنی گینٹز کے درمیان کوئی واضح فاتح نہیں ہوا، جس کی وجہ سے مارچ ۲۰۲۰ء میں میں تیسرے انتخابات ہوئے۔ اس دوران امریکی صدر ڈونالڈ ٹرمپ نے اپنے مشرق وسطیٰ کے امن منصوبے کی نقاب کشائی سے قبل وہائٹ ہاوس میں نیتن یاہو اور گینٹز کی میزبانی کی۔ اس منصوبے کو فلسطین، عرب لیگ اور اسلامی تعاون تنظیم (او آئی سی) نے یکسر مسترد کردیا تھا ''صدی کی ڈیل''، جیسا کہ ٹرمپ اسے کہتے ہیں، غلط سمجھا جاتا ہے اور بنیادی طور پر امدادی رقم کے بدلے فلسطینیوں کے حقوق کے حوالے کرنے کے مترادف ہے اور دور یا ستی حل کو مؤثر طریقے سے ختم کردیتا ہے۔

بہ شکریہ: (INQUILAB.COM)

❊ ❊ ❊

غزہ کی پٹی یا کھلی جیل؟

غزہ پر اسرائیلی فضائیہ کی بمباری مسلسل جاری ہے۔ بمباری کے ذریعے ایک کے بعد دوسری عمارت اور ایک کے بعد دوسرے ہمسائے کو نشانہ بنایا جارہا ہے۔ یہ صورت حال فلسطینی مزاحمتی گروپ حماس کی طرف سے اسرائیل پر غیر معمولی اور ایسے راکٹ حملوں کے بعد شروع ہوئی ہے جن کی ماضی میں کوئی نظیر موجود نہیں تھی۔

اب تک کی اس دوطرفہ جنگ میں فریقین کے ۲۱۰۰ سے زائد افراد مارے جاچکے ہیں۔ خدشہ ہے کہ جنگ میں وسعت آجائے گی؛ کیونکہ اسرائیل کی طرف سے اہل غزہ کو انتقام کا نشانہ بنانے میں شدت آرہی ہے۔

جس غزہ کو اسرائیل کی طرف سے بارہا بمباری کا نشانہ بناتے کئی دہائیوں سے اسرائیلی فوج تباہ کرتی آئی ہے۔ اس کی شکل کیا ہے۔ جغرافیہ کیا ہے۔ اہمیت کیا اور یہاں کے رہنے والے کون لوگ ہیں۔ نیز اسے دنیا کی سب سے بڑی کھلی جیل کیوں کہا جاتا ہے۔ ان سوالوں کو اس رپورٹ میں دیکھتے ہیں۔

غزہ کی پٹی کیا ہے؟

یہ چالیس کلومیٹر پر پھیلا خشکی کا ایسا ٹکڑا ہے جو اسرائیل اور مصر کے درمیان ایک سینڈوچ کی طرح موجود ہے۔

غزہ کے ساتھ ہی مغربی کنارے کا فلسطینی علاقہ بھی ہے۔ یہ دونوں جگہیں غزہ اور مغربی کنارا فلسطینی علاقے ہیں۔ دونوں کئی دہائیوں سے جنگی مرکز بنے ہوئے ہیں۔

آج کل مسلسل اسرائیلی بمباری کے باعث غزہ پر گہرے دھویں کے بادل مرغولوں کی طرح جابجا نظر آتے ہیں۔ البتہ رات کے وقت اس بادل نما بارودی دھویں سے زیادہ آگ کی بارش شعلوں کا روپ دھارتی نظر آنے لگتی ہے۔

اسرائیل نے غزہ شہر کو پہلے سے ہی بلاک کر رکھا ہے۔ یہ بلاکیڈ کئی برسوں پر محیط ہے۔ اس وجہ سے غزہ کے اردگرد رکاوٹیں، دیواروں کی صورت میں باڑ اور دوسری رکاوٹیں کھڑی ہیں۔

حماس کے پاس اس غزہ کی پٹی کا کنٹرول ۲۰۰۷ء سے ہے۔ تب سے ہی اسرائیل نے اس کو محاصرے میں لے کر اسے دنیا کی ایسی کھلی اور بڑی جیل بنا دیا ہے جس پر ایک طرف آنے جانے کی اجازت نہیں تو دوسری جانب اسرائیل کی بمباری کی زد میں رہتی ہے۔ اہم بات یہ ہے کہ غزہ سے باہر کے سب راستے حتی کہ جڑی ہوئی ساحلی پٹی بھی اسرائیلی جبری قبضے میں ہے۔

غزہ پٹی کیسے بنی؟

غزہ کی یہ پٹی ۱۹۱۷ء تک عثمانی خلافت کا حصہ رہی۔ ۱۹۱۷ء میں اس کا کنٹرول برطانیہ کے پاس چلا گیا۔

جب اسرائیل کا ۱۹۴۸ء میں قیام عمل میں لایا گیا تو ہزاروں فلسطینی مہاجرین کو غزہ میں دھکیل دیا گیا۔ اب ان کے وارثین اس زیر محاصرہ غزہ میں رہتے ہیں۔ اسی سال غزہ کی پٹی مصر کا حصہ بن گئی۔

بیس سال بعد ۱۹۶۷ء میں اسرائیل نے مصر، اردن اور شام کے خلاف جنگ کی تو اسرائیل کا غزہ پر قبضہ ہو گیا۔ اسی دوران یروشلم اور مغربی کنارا بھی اسرائیل کے زیر قبضہ چلا گیا۔

فلسطینیوں کا ان تینوں علاقوں کے بارے میں موقف ہے کہ یہ ان کی مستقبل کی فلسطینی ریاست کا حصہ ہیں۔

اسرائیل نے تیس برسوں سے زیادہ قبضہ رکھا اور یہودی بستیوں کی تعمیر بھی کی۔

۱۹۸۷ء اور ۱۹۹۳ء کے دوران غزہ میں فلسطینیوں کا انتفادہ سامنے آیا۔ یہ مزاحمت غزہ اور مغربی کنارے میں پھیل گئی۔

۱۹۹۰ء کی دہائی میں اوسلو امن عمل شروع ہو گیا۔ جس کے نتیجے فلسطینی ریاست کا مطالبہ فلسطینی اتھارٹی کی صورت سامنے آیا۔ اسی معاہدے کے بعد غزہ اور مغربی کنارے کو بھی آزادی تو نہ ملی البتہ جزوی سی سہولت مل گئی۔

تاہم ۲۰۰۵ء میں اسرائیل کو انتفادہ کی وجہ سے غزہ پر اپنا کنٹرول چھوڑنا پڑا۔ اسی سبب اسرائیل نے غزہ سے ۹۰۰۰ یہودی آبادکاروں کو ہٹا لیا۔ اسرائیلی فوج کو بھی نکال لیا۔

اگلے سال فلسطینی اتھارٹی کے انتخابات ہوئے اور حماس نے محمد عباس کے فتح گروپ سے الیکشن جیت لیا۔ شہر کا کنٹرول حماس کے منتخب لوگوں کی حکومت کے ہاتھ آ گیا؛ لیکن اس کے بعد

فلسطینی اتھارٹی جس کی کمان محمود عباس کے پاس ہے کے الیکشن دوبارہ نہیں کرائے گئے کہ حماس دوبارہ نہ جیت جائے۔

دوسری جانب اسرائیل نے حماس کے کنٹرول سنبھالنے کے بعد غزہ کا محاصرہ کرلیا۔اسرائیل کا دعوی تھا کہ اس طرح جنگجوؤں کو اسلحے کی سپلائی کو روکا جاسکے گا۔

اقوام متحدہ اور دوسرے انسانی حقوق گروپوں کی طرف سے اسرائیل کے اس محاصرے کو تنقید کا نشانہ بنایا گیا۔اس محاصرے کی وجہ سے عملا اسرائیلی قبضہ چل رہا ہے۔

غزہ میں کون لوگ رہتے ہیں؟

غزہ دنیا کے گنجان ترین علاقوں میں سے ایک ہے۔اس کی آبادی ۲۳؍لاکھ ہے۔ان ۲۳لاکھ میں سے نصف آبادی بچوں پر مشتمل ہے۔ ہونیسیف کے مطابق تقریباً دس لاکھ بچے غزہ میں رہتے ہیں۔ان کی عمر پندرہ سال سے کم ہے اور یہ کل آبادی کا چالیس فیصد ہیں۔

عالمی بنک کے اعداد وشمار کے مطابق غزہ دنیا کے ان علاقوں میں بھی شامل ہے جہاں دنیا کی بدترین بے روزگاری ہے؛ جب کہ غزہ میں رہنے والے ۸۰ فیصد لوگ سخت غربت کی زندگی گذار رہے ہیں۔

پینے کا صاف پانی، بجلی اور مناسب خوراک سے ہی محروم نہیں؛ بلکہ طبی سہولیات کے حوالے سے انتہائی کسمپرسی ہے۔اس کے باوجود اسرائیل کی ان دنوں مسلسل جاری بمباری سے بھی پہلے اسرائیل نے ایک ٹوٹی پھوٹی سی ایمبولینس گاڑی کو بھی نشانے پر لے لیا۔

اقوام متحدہ کے ادارے اونروا کے مطابق غزہ میں پچانوے فیصد شہری صاف پانی سے محروم ہیں۔اونروا کا کہنا ہے کہ پچھلے دس پندرہ برسوں کے دوران غزہ کے باسیوں کی زندگی پہلے سے بھی زیادہ پسماندگی کا شکار ہے۔

کھلی جیل کیوں کہا جاتا ہے؟

دنیا کی سب سے بڑی کھلی جیل کا نام انسانی حقوق کی تنظیم، دی ہیومن رائٹس واچ نے غزہ کو دیا ہے۔اسرائیلی انسانی حقوق کی تنظیم کے مطابق اسرائیلی فوج فلسطینیوں کو عام طور پر غزہ کے دونوں طرف آنے جانے سے روکتی ہے۔

بشکریہ: (https://urdu.alarabiya.net/)

قتل گاہ غزّہ سے آخری پیغام

از: حامد میر

ہم فلسطین کے یتیم اور بے سہارا بچے ہیں۔نہیں معلوم ہم مزید کتنے دن زندہ رہیں گے۔ ہمارے گھر اسرائیلی بمباری میں تباہ ہوگئے، ہمارے والدین بمباری میں شہید ہوگئے، ہم وہ بچے ہیں جو اس بمباری میں زخمی ہوکر غزہ کے ہسپتالوں میں پہنچے اور پھر ہم ان ہسپتالوں میں بھی بمباری کا نشانہ بنے۔ کچھ ہسپتالوں میں مارے گئے کچھ ہسپتالوں کے ملبے سے زندہ نکال لیے گئے۔ ہوسکتا ہے اگلی بمباری میں ہم بھی مارے جائیں اور ہمیں بھی ہزاروں فلسطینیوں کی طرح اجتماعی قبروں میں دفن کردیا جائے۔

اجتماعی قبروں میں دفن ہونے سے قبل ہم دنیا بھر کے بچوں تک اپنا ایک پیغام پہنچانا چاہتے ہیں۔ہم یہ پیغام بچوں تک اس لیے پہنچانا چاہتے ہیں کہ ہم دنیا بھر کے بچوں کو اپنی طرح بے گناہ سمجھتے ہیں۔ ہمارا قصور صرف یہ تھا کہ ہم سمندر کے کنارے پر غزہ کی پٹی میں فلسطینی والدین کے گھر پیدا ہوئے۔اسکول میں ہم نے سنا تھا کہ غزہ دنیا کی سب سے بڑی جیل ہے؛ لیکن سات اکتوبر۲۰۲۳ء کے بعد غزہ دنیا کی سب سے بڑی قتل گاہ بن چکی ہے۔

ہم نہیں جانتے ہیں کہ سات اکتوبر کو اسرائیل پر حماس کے حملے میں کتنے بچے مارے گئے تھے؛ لیکن ہم نے اپنی آنکھوں کے سامنے اسرائیلی بمباری سے ہزاروں بچوں کو مرتے دیکھا ہے۔مرنے والے فلسطینی بچوں میں سے اکثر ایسے تھے جنھوں نے ابھی بولنا بھی نہیں سیکھا تھا۔آپ نے اپنی ٹی وی اسکرینوں پر ہمارا قتل عام تو دیکھا ہوگا۔

ہمیں پتہ ہے کہ ہماری خون آلود لاشیں اور چیخ وپکار دیکھ کر آپ کو بہت تکلیف ہوئی ہوگی؛ لیکن ہم آپ کو بتانا چاہتے ہیں کہ آپ کا تعلق کسی بھی ملک،قوم یا نسل سے ہو آپ اپنے آپ کو محفوظ نہ سمجھیں۔ ہمارے اور آپ کے بڑوں نے اس دنیا کو انتہائی غیر محفوظ بنا دیا ہے۔ آج ہم مارے

جارہے ہیں،کل آپ کے ساتھ بھی وہی ہوگا جو ہمارے ساتھ ہوا ہے۔

پیارے بچو۲۸/اکتوبر کو اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی نے غزہ میں سیز فائر کے لیے اکثریت رائے سے ایک قرارداد منظور کی۔ یہ قرارداد غزہ پر اسرائیلی بمباری شروع ہونے کے تین ہفتے بعد پیش کی گئی۔ سپر پاور امریکا اور اسرائیل نے اردن کی طرف سے پیش کی جانے والی اس قرارداد کی مخالفت کی؛ لیکن اس کے باوجود قرارداد منظور ہوگئی۔ یہ قرارداد منظور ہونے کے باوجود اسرائیل نے سیز فائر نہیں کیا اور ہمارا قتل عام جاری رہا۔ سات اکتوبر سے ۲۸/اکتوبر کے درمیان تین ہفتوں میں ہم نے وہ کچھ سیکھ لیا ہے جو آپ اگلے تیس سال تک کسی درس گاہ میں نہ سیکھ پائیں گے۔

ان تین ہفتوں میں بہت سے مذہبی رہنماؤں، یونیورسٹی کے پروفیسروں، ڈاکٹروں اور نرسوں کے ساتھ ہم نے کھلے آسمان تلے راتیں گزاری ہیں۔ ان تاریک راتوں میں اسرائیلی بمباری کی گھن گرج نے ہمیں یہ سکھایا کہ تشدد سے مزید تشدد جنم لیتا ہے۔ ہمیں الاھلی عرب ہسپتال کا وہ مسیحی پادری آج بھی یاد ہے جو اپنے چرچ سے ہمارے لیے پانی کی بوتلیں لایا۔ اس نے ہمیں فلسطین کی تاریخ بتائی۔ اس نے بتایا کہ فلسطین ارض انبیاء ہے۔ مسلمان، مسیحی اور یہودی اہل کتاب ہیں؛ لیکن یہ اپنی اپنی کتاب سے ہدایت کی بجائے کتاب کے نام پر ایک دوسرے سے لڑے جارہے ہیں۔

ہمیں وہ مسلمان عالم دین بھی یاد ہے جو تمام دن اسرائیلی بمباری میں شہید ہونیوالے فلسطینیوں کے جنازے پڑھا پڑھا کر تھک چکا تھا۔ اسے فرصت ملی تو اپنی زخمی پوتی کو لے کر ہمارے پاس آ بیٹھا اور مسیحی پادری کی گفتگو سننے لگا۔ پھر مسیحی پادری اور مسلمان عالم نے آپس میں گفتگو شروع کردی۔ دونوں ایک دوسرے کو بتارہے تھے کہ سرزمین فلسطین پر یہ پہلا قتل عام نہیں ہے۔

مسلمانوں اور صہیونی یہودیوں میں اختلاف کی وجہ ''ہیکل سلیمانی'' ہے۔ یہودی اسے اپنا مقدس مقام سمجھتے ہیں اور مسلمان اسے اپنا مقدس مقام سمجھتے ہیں۔ یہودیوں کا خیال ہے کہ مسلمانوں نے ان کے مقدس مقام پر مسجد تعمیر کی؛ لیکن مسلمانوں کا دعویٰ ہے کہ یہاں مسجد پہلے سے موجود تھی جیسے کہ خانۂ کعبہ بھی ظہور اسلام سے پہلے موجود تھا۔ مسجد اقصیٰ کی معروف نسبت حضرت سلیمان علیہ السلام کے ساتھ ہے۔ ان کا محل یہاں موجود تھا جو ''ہیکل'' کہلاتا تھا۔ بعض روایات کے مطابق اس محل کے اندر ان کی عبادت گاہ بھی موجود تھی۔

نبی کریم حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اپنے سفر معراج کے دوران مسجد الحرام سے اسی مسجد اقصیٰ پہنچے اور تمام انبیاء کی نماز کی امامت کرنے کے بعد سات آسمانوں کے سفر پر روانہ ہوئے۔

قرآن مجید کی سورۃ الاسرائیل گواہی دیتی ہے کہ یروشلم پر مسلمانوں کے قبضے سے پہلے یہ مسجد وہاں موجود تھی۔ایک حدیث کے مطابق نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ زمین پر سب سے پہلی مسجد، مسجد الحرام (بیت اللہ) ہے اور دوسری مسجد اقصیٰ ہے جو پہلی مسجد بننے کے چالیس سال بعد وجود میں آئی۔

مسجد اقصیٰ مسلمانوں کا قبلۂ اول ہے۔ پہلے پہل مسلمان مسجد اقصیٰ کی طرف رخ کر کے نماز پڑھتے تھے پھر خانہ کعبہ کی طرف رخ کر کے نماز پڑھنے کا حکم آیا۔مسلمانوں نے حضرت عمر فاروقؓ کے دور میں بیت المقدس کو فتح کیا تو یہاں پر ایک باقاعدہ مسجد تعمیر کی گئی۔صلیبی جنگوں میں عیسائیوں نے اس پر قبضہ کرلیا؛لیکن صلاح الدین ایوبی نے اسے واپس لیا۔

۱۹۱۴ء میں پہلی جنگ عظیم شروع ہوئی تو ترکی نے برطانیہ کے خلاف جرمنی کا ساتھ دیا۔برطانیہ نے کچھ عرب حکمرانوں سے وعدہ کیا کہ اگر وہ ترکی کے خلاف ان کی مدد کریں گے تو مشرق وسطیٰ خلافت عثمانیہ ختم کر کے عربوں کے حوالے کردیا جائے گا۔دوسری طرف برطانیہ نے یہودیوں سے کہا کہ اگر وہ جنگ میں برطانیہ کی مالی امداد کریں گے تو انھیں فلسطین کی جگہ اسرائیل بنا کر دیا جائے گا۔

۱۹۱۷ء میں برطانوی وزیر خارجہ آرتھر جیمز بالفور نے یہ اعلان کردیا کہ یہودیوں کو فلسطین میں وطن دیا جائے گا؛لیکن عرب شیوخ کو سمجھ نہ آئی۔دوسری جنگ عظیم کے بعد برطانیہ نے فلسطین میں یہودیوں کی آبادکاری شروع کی اور ۲۹؍نومبر ۱۹۴۷ء کو اقوام متحدہ سے قرارداد منظور کرادی جس کے تحت فلسطین اور اسرائیل کے نام سے دو ریاستیں قائم ہونا تھیں؛ جب کہ بیت المقدس کو بین الاقوامی نگرانی میں دینا تھا؛ کیونکہ یہ تین بڑے مذاہب کے ماننے والوں کے لیے مقدس جگہ تھی۔

اسرائیل نے بیت المقدس پر قبضہ کر کے اقوام متحدہ کی قرارداد کی خلاف ورزی کی۔اسرائیل کی طرف سے فلسطینیوں کو پہلی دفعہ نیست و نابود کرنے کی کوشش نہیں ہو رہی۔ یہ کوشش پہلے بھی کی گئی لیکن کامیاب نہ ہوئی۔۱۹۶۹ء میں ایک یہودی کی طرف سے مسجد اقصیٰ کو نذر آتش کرنے کے ردعمل میں اسلامی ممالک کی تنظیم او آئی سی تشکیل دی گئی جس نے ۲۰۲۳ء میں غزہ کے قتل عام میں صرف مذمتی قراردادیں منظور کیں۔

ہم فلسطینی بچے اسرائیل کی حالیہ بمباری میں مارے جانے سے قبل دنیا بھر کے بچوں سے اپیل کرتے ہیں کہ ہمارے لیے نہیں؛ بلکہ اپنے مستقبل کے لیے دنیا میں امن کے لیے آواز اٹھاؤ ورنہ تمہارے ساتھ وہی ہوگا جو ہمارے ساتھ ہوا۔آخر میں ہم او آئی سی کے بڑوں سے کہنا چاہتے ہیں کہ ہم تو مر کر بھی زندہ رہیں گے؛لیکن افسوس کہ تم اپنے آپ کو زندہ سمجھتے ہو؛ جب کہ تم تو مر چکے ہو!

علامہ کشمیریؒ شرح حدیث منہج وخصوصیات

(۳/۲)

از: مولانا محمد اجمل قاسمی
استاذ جامعہ قاسمیہ مدرسہ شاہی مرادآباد

آمدم برسرمطلب

اس مقالے کا پورا عنوان (علامہ کشمیری شرح حدیث منہج وخصوصیات) ہے، مقالے کا پہلے جز ''علامہ کشمیری'' کی تشریح میں یہ سطریں سپرد قرطاس ہوئی، یہ صفحات جہاں مذکورہ جز کی ایک سرسری اوراجمالی توضیح ہیں وہیں ''شرح حدیث منہج وخصوصیات'' کے لیے ایک تمہید کی بھی حیثیت رکھتی ہیں، شرح حدیث میں جب علامہ کے منہج اورخصوصیات کا بیان ہوتا ہے تو وہ بہت سے ایسے لوگوں کو مبالغہ آمیز معلوم ہوتا ہے، جوعلامہ کشمیری کی شخصیت، علوم وفنون میں ان کی جامعیت، اوران کے امتیازات وخصوصیات سے ناواقف ہیں؛ لیکن اگر کوئی ان کی شخصیت کی جامعیت اوران کے امتیازات وخصوصیات سے واقف ہوتو آپ کے متعلق جو باتیں قاری کو مبالغہ آمیز نظر آتی ہیں، وہی چیزیں اسے بالکل معقول، فطری اور مبنی برحقیقت معلوم ہونے لگتی ہیں، تواب آیئے مقالہ کے اگلے جز، ''شرح حدیث: منہج وخصوصیات'' کا رخ کرتے ہیں، جواس بحث کا مرکزی اور جوہری عنصر اور حضرت علامہ کشمیری کی خدمات وکارناموں کی فہرست میں سب سے جلی عنوان ہے، اورواقعہ ہے کہ اگراس موضوع کے اطراف وجوانب کو سمیٹنے کی کوشش کی جائے تو مقالہ کافی طویل ہوجائے گا، ناچیز کوشش کرے گا حضرت کے براہ راست مستفیدین اورتلامذہ کی تحریروں اور بیانات سے ضروری اقتباس کی مدد سے موضوع کا جوہر اور خلاصہ پیش کیا جائے۔

شرح حدیث میں علامہ کشمیریؒ کے مشائخ کا منہج

علامہ کے منہج وخصوصیات کو بہتر طریقے سے سمجھنے کے لیے ضروری ہے کہ شرح حدیث میں آپ کے پیشرو آپ کے مشائخ کے منہج جانا جائے، اورآپ کے مشائخ کے نہج کو سمجھنے کے لیے ہم علامہ کے

اس تاریخی خطبہ استقبالیہ کو بنیاد بناتے ہیں، جو آپ نے اپنے اساتذہ کے مشورے وایماء پر علامہ رشید رضا مصری کی دارالعلوم دیوبند آمد کے موقع سے ارتجالاً پیش کیا تھا۔

اس خطبے میں علامہ نے شروع میں مختصراً علوم اسلامی سے ہندستان کی بے بضاعتی کا حال بیان کیا ہے، پھر اس کے بعد حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کی علمی شخصیت، ان کے ذریعہ کتاب وسنت کے علوم کی ہندستان میں آمد، اور پھر ان کی تصانیف اور دروس کے ذریعہ ان علوم کی اشاعت کا تذکرہ کیا ہے۔

اس کے بعد شرح حدیث میں شاہ صاحب کے نہج کو واضح کرتے ہوئے فرمایا کہ شاہ صاحب نے موطا امام مالک کی شرح ''مسوی'' تحریر فرمائی، اور اس میں فقہاء حدیث کا طرز اپنایا، مناط کی تحقیق، تنقیح اور تخریج فرما کر اس کی روشنی میں احادیث کی تشریح کی۔ پھر آپ نے بتایا مناط کی تحقیق، تنقیح اور تخریج کو ہم نے علماء اصول کی اصطلاح کے مطابق استعمال کیا ہے، اور لگے ہاتھ آپ نے ان اصطلاحات ثلاثہ کی وضاحت فرمائی، جس کا خلاصہ حسب ذیل ہے:

تحقیق مناط: شارع کا یہ عام انداز ہے کہ وہ جزئیات کے ضمن میں اصول اور کلیات بیان کرتا ہے، جزئیات سے ان کلیات اور اصول کو نکال کر اسی طرح کے دیگر جزئیات میں ان کلیات کے ذریعہ حکم بیان کرنا تحقیق مناط کہلاتا ہے، اور فرمایا کہ یہ عمل قیاس نہیں ہے؛ اس لیے خاص وعام یہ کام انجام دے سکتے ہیں، اجتہاد اس کے لیے شرط نہیں ہے۔

تنقیح مناط: نص میں کسی صورت کا حکم بیان ہوتا ہے، اور اس صورت کے ضمن میں بعض اور باتیں بھی مذکور ہوتی ہیں، ان میں کوئی بات ایسی ہوتی ہے جو حکم میں بطور علت موثر ہے، اور بقیہ چیزیں اتفاقی طور پر مذکور ہوتی ہیں، اب ان تمام امور میں یہ جاننا کہ بحیثیت علت کون سی چیز موثر ہے یہ تنقیح مناط ہے۔

تخریج مناط: نص میں کسی صورت کا حکم بیان ہوتا ہے، اور اس صورت کے ضمن میں بعض اور باتیں بھی مذکور ہوتی ہیں، اور ان میں سے ہر ایک بات علت اور مناط بننے کی صلاحیت رکھتی ہے، مجتہد ان میں سے کسی ایک کو ترجیح دے کر اس کو علت قرار دیتا ہے، مناط کی تنقیح اور تخریج مجتہد ہی کا کام ہے۔ یہ عام لوگوں کی جولان گاہ نہیں ہے۔

حضرت شاہ صاحب نے موطا کی شرح تحریر کرتے ہوئے ان امور کی رعایت کی اور اس میں جامع فقہ پیش کی، نیز شاہ نے اپنی کتاب ''الانصاف فی اسباب الاختلاف، اور عقد الجید فی مسائل

الاجتہاد والتقلید'' میں یہ بھی تحریر کیا کہ اجتہادی مسائل میں حق ایک سے زائد ہوتا ہے، اوراجتہادی مسائل سے مراد وہ مسائل ہیں جن میں دلائل متعارض ہوں، کوئی ایک واضح قطعی دلیل موجود نہ ہو، اگر مسئلہ میں قطعی دلیل موجود ہوتو حق وہاں ایک ہوگا، اوروہ وہی ہوگا جس کے حق میں دلیل قطعی ہوگی۔

پھر آپ نے شاہ ولی اللہ سے لے کرمولانا محمد قاسم نانوتوی اورمولانا رشیدگنگوہی تک کے واسطوں کواجمالاً ذکر کیا ہے، اس کے بعد دارالعلوم دیوبند کے قیام کا تذکرہ کیا ہے، اوراس کے قیام کا مقصد یہ بتایا کہ اس کا اصل مقصد حدیث کوفقہ حدیث کے ساتھ پڑھنا اور پڑھانا ہے، بقیہ بیشتر دوسرے علوم وفنون جو پڑھے پڑھائے جاتے ہیں مبادی کی حیثیت سے رکھے گئے ہیں۔

پھر آگے آپ نے فرمایا کہ حدیث وفقہ حدیث میں یہ ہمارے مشائخ کا طریقہ ہے، جوافراط وتفریط کے درمیان ایک معتدل طریقہ ہے۔ پھر مسائل خلافیہ میں ائمہ اربعہ کے طریق اورنہج پر تبصرہ کرنے کے بعد کہتے ہیں کہ ہمارے مشائخ اس طرح کے مسائل میں تشدد سے کام نہیں لیتے؛ بلکہ اعتدال کی راہ اختیارکرتے ہیں، وہ متعارض احادیث میں حتی الامکان جمع وتطبیق کی کوشش کرتے ہیں، اور بالعموم ایسی توجیہات پیش کرتے ہیں جن کو بلاتکلف قبول کیا جاسکتا ہے، اورتطبیق وتوجیہہ ممکن نہ ہو، توان کے نزدیک دونوں متعارض احادیث سے ثابت ہونے والے احکام سنت قرار پاتے ہیں، جس میں فقہاء ترجیح واختیار کا طریقہ اپناتے ہیں۔علامہ نے اپنی ہر بات کومثالوں سے واضح کیا ہے، جسے یہاں اختصار کے پیش نظر حذف کردیا گیا ہے۔

حضرت کشمیری کی تقریر کا جوخلاصہ پیش کیا گیا، اگر ہم اس سے شرح حدیث میں مشائخ علماء دیوبند کا نہج جاننا چاہیں، تودرج ذیل باتیں سامنے آتے ہیں:

(الف) احادیث کی تشریح کرتے ہوئے نصوص میں مذکوراحکام کی فقہاء امت نے جومناط اورعلتیں بیان کی ہیں ان کوواضح کرنا، اورپھران علتوں کی روشنی میں احکام کی وضاحت کرنا، گویا حدیث کے ساتھ ''فقہ الحدیث'' پڑھانے کا بھی اہتمام کرنا۔اورعلامہ کی نظر میں دارالعلوم دیوبند میں رائج درس حدیث کا یہ بنیادی مقصد ہے۔

(ب) مجتہد فیہ مسائل میں حق متعدد ہوتا ہے؛ اس لیے ہرفقیہ کواپنے اجتہاد پرعمل کی گنجائش ہے۔

(ج) متعارض دلائل میں حتی الامکان جمع وتطبیق کا طریقہ اختیارکرنا، اوراحادیث کی ایسی توجیہ پیش کرنا جوقابل قبول ہو، اوراس توجیہ سے ہر ہرحدیث پراپنی اپنی جگہ عمل کی گنجائش باقی رہتی ہو۔

(ہ) اگرجمع وتطبیق کی گنجائش نہ بنتی ہو، تومتعارض احادیث سے ثابت ہونے والے ہرامر

کوثابت بالنص اور مسنون مانا جائے اور ترجیح واختیار کا طریقہ اپنایا جائے۔

علامہ کشمیری کے بیان کے ساتھ بعض دوسرے حضرات کے بیان کو ملائیں تو کچھ اور باتیں بھی سامنے آتی، صاحب ''نقش دوام'' تحریر کرتے ہیں:

''عرض کر چکا ہوں کہ شاہ ولی اللہؒ کا طریق درس حدیث کی ضروری وضاحت سے زیادہ نہیں تھا، (واضح رہے یہ شاہ ولی اللہ کے درس کا انداز تھا، اور پر جو علامہ کشمیری نے ذکر کیا ہے وہ آپ کی تحریری شرح کا انداز تھا) مولانا گنگوہیؒ ومولانا نانوتویؒ نے اس میں فقہ حنفی کے مآخذ کی نشاندہی کا اضافہ کیا'' (نقش دوام، ص: ۱۴۷)

فقہ حنفی کے مآخذ کی نشاندہی کے اضافے کی ضرورت کیوں پیش آئی، اس کا جواب دیتے ہوئے صاحب ''نقش دوام'' لکھتے ہیں:

''ہندستان میں حدیث کا فن شہرت پذیر ہوا، تو اسے ایک نئے فتنے سے مقابلہ کرنا پڑا، یہ فتنہ غیر مقلدین کا پیدا کردہ تھا، جس میں یہ سمجھانے کی کوشش کی جارہی تھی کہ ابوحنیفہ الامام نے آں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی تمام احادیث وارشاد کے علی الرغم اپنی ذاتی رائے وقیاسات پر اسلامی شریعت کا ایک نیا نظام قائم کیا ہے۔۔۔ اس لیے دیوبند کو اپنے آغاز ہی سے جن بعض افکار وعقائد سے تصادم کی نوبت آئی ان میں سے ایک تو امام ابوحنیفہ کے متعلق اسی مغالطہ کا ازالہ تھا۔۔۔ (نقش دوام، ص: ۱۴۷)

''نقش دوام'' کے جن صفحات سے مذکورہ بالا اقتباس کیے گئے ہیں ان سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ اکابر شرح احادیث میں حسب ضرورت باطل خیالات بالخصوص اپنے زمانے کی بدعات اور گمراہیوں کی تردید اور ابطال کا اہتمام کیا کرتے تھے۔ اس طرح مذکورہ بالا تصریحات سے یہ دو باتیں اور معلوم ہوئیں:

(و) شرح حدیث میں احکام کی مناط اور علتیں بیان کرنے کا سلسلہ تو پہلے سے ہی تھا، ضرورت کے پیش نظر فقہ حنفی کے مآخذ بیان کرنے کا خصوصی اہتمام کیا گیا۔

(ز) باطل افکار بالخصوص اپنے زمانہ کے گمراہ کن خیالات وبدعات کی تردید وابطال پر بھی توجہ دی گئی۔

خلاصہ منہج: حضرت علامہ کی تصریح اور دیگر حضرات کے بیان سے شرح حدیث میں حضرت شاہ ولی اللہ سے لے کر مولانا نانوتوی، مولانا گنگوہی، اور شیخ الہندؒ کے منہج خلاصہ وہ چھ باتیں نکل کر آتی

ہیں جو ہم نے (الف) سے (ز) تک نمبر وار تحریر کی ہیں۔

شرح حدیث میں علامہ کشمیری کا منہج

ناچیز نے جو باتیں پیش کی ہیں یا جو باتیں آئندہ پیش کرے گا اس سے یہ بات صاف طور پر نکھر کر سامنے آتی ہے کہ علامہ کشمیریؒ نے شیخ رشید رضا مصری کے سامنے شرح حدیث میں اپنے مشائخ کے منہج کا جو تعارف پیش کیا ہے، اور اس میں بعض اضافہ جو دوسرے لوگوں کے بیانات سے کیا گیا ہے شرح حدیث میں بنیادی طور پر وہی باتیں آپ کے پیش نظر بھی تھیں؛ اس لیے ہم انھیں باتوں کو علامہ کا بھی منہج قرار دے سکتے ہیں، جسے علامہ نے اپنی نادر تحقیقات، انقلاب آفریں انداز تدریس سے سنوارا، نکھارا، اور ترقی دے کر کافی آگے بڑھایا ہے؛ اس لیے ہم ذیل کی سطروں میں علامہ کے منہج کے طور انھیں مذکورہ امور بالا کو ترتیب وار پیش کرتے ہیں:

(الف) احادیث کی تشریح کرتے ہوئے، نصوص میں مذکور احکام کی فقہاء امت نے جو مناط اور علتیں بیان کی ہیں، ان کو واضح کرنا، اور پھر ان علتوں کی روشنی میں احکام کی وضاحت کرنا، گویا حدیث کے ساتھ فقہ الحدیث پڑھانے کا بھی اہتمام کرنا۔ اور علامہ کی نظر میں دارالعلوم دیوبند رائج درس حدیث کا یہ بنیادی مقصد ہے۔

(ب) مجتہد فیہ مسائل میں حق متعدد ہوتا ہے؛ اس لیے ہر فقیہ کو اپنے اجتہاد پر عمل کی گنجائش ہے۔

(ج) متعارض دلائل میں حتی الامکان جمع وتطبیق کا طریقہ اختیار کرنا، اور احادیث کی توجیہ پیش کرنا جو قابل قبول ہو، اور اس توجیہ سے ہر ہر حدیث پر اپنی اپنی جگہ عمل کی گنجائش باقی رہتی ہو۔

(ہ) اگر جمع وتطبیق کی گنجائش نہ بنتی ہو، تو متعارض احادیث سے ہر ثابت ہونے والے ہر امر کو مسنون مانا جائے اور ترجیح واختیار کا طریقہ اپنایا جائے۔

(و) شرح احادیث میں احکام کے مناط وعلت کے بیان کرنے کے ساتھ فقہی ضرورت کے پیش نظر فقہ حنفی کے مآخذ کے نشاندہی کا خصوصی اہتمام۔

(ز) باطل افکار بالخصوص اپنے زمانہ کے گمراہ کن خیالات وبدعات کی تردید وابطال۔

(جاری)

❊ ❊ ❊

رائے، اہل رائے اور فقہائے حنفیہ

از: مولانا عبید الرحمٰن

''رائے'' کا لفظ عربی زبان میں تجویز ومشورہ، خیال واعتقاد، عقل وتدبیر اور غور وفکر وغیرہ معانی کے لیے استعمال ہوتا ہے، ''اہل رائے'' کا لفظ ان افراد کے لیے استعمال کیا جاتا ہے جو رائے کے ساتھ زیادہ ربط وتعلق رکھتے ہیں۔ دریافت طلب سوال یہ ہے کہ:

الف: ''اہل رائے'' کن لوگوں کو کہا جاتا ہے؟ کون اس لفظ کا مصداق ہیں؟

ب: اس کی حیثیت کیا ہے؟ کیا یہ مدح ومنقبت کا لفظ ہے یا مذمت کا عنوان؟

ان دونوں باتوں کی تہہ تک پہنچنے کے لیے خود ''رائے'' کے لفظ کی حقیقت اور اس کی حیثیت کو جاننا ضروری ہے۔ اہل علم کے ہاں رائے کا لفظ مختلف مفاہیم ومقاصد کے لیے استعمال ہوتا ہے، کبھی تو تردید ومذمت کے طور پر اس کا استعمال کیا جاتا ہے؛ جب کہ بسا اوقات مدح وتعریف کے سیاق میں اس کا اطلاق ہوتا ہے، جہاں مذمت مقصود ہو، وہاں اس کا مقصود کچھ ہوتا ہے اور جہاں مدح ومنقبت کے سیاق میں واقع ہو، وہاں اس کا پس منظر کچھ اور ہوتا ہے، یہ کیسے متصور ہوسکتا ہے کہ ایک ہی چیز کو ایک ہی وقت اچھا بھی کہا جائے اور بُرا بھی قرار دیا جائے!

علامہ ابن القیم کی تحقیق

علامہ ابن قیم الجوزیہ رحمہ اللہ نے اپنی مفید کتاب ''اعلام الموقّعین'' میں اپنے مزاج ومذاق کے مطابق اس پر بڑی تفصیل سے گفتگو فرمائی ہے، اس میں وہ تحریر فرماتے ہیں:

وإذا عرف هذا فالرأى ثلاثة أقسام: رأى باطل بلا ريب، ورأى صحيح، ورأى هو موضع الاشتباه، والأقسام الثلاثة قد أشار إليها السلف، فاستعملوا الرأى الصحيح، وعملوا به وأفتوا به، وسوغوا القول به، وذموا الباطل، ومنعوا من العمل والفتيا والقضاء به، وأطلقوا ألسنتهم بذمه وذم أهله.

والقسم الثالث: سوغوا العمل والفتيا والقضاء به عند الاضطرار إليه حيث لا يوجد منه بد، ولم يلزموا أحدا العمل به، ولم يحرموا مخالفته، ولا جعلوا مخالفه مخالفا للدين، بل غايته أنهم خيروا بين قبوله ورده؛ فهو بمنزلة ما أبيح للمضطر من الطعام والشراب الذى يحرم عند عدم الضرورة إليه.(۱)

ترجمہ:اسی بنا پر رائے کی تین قسمیں ہیں: باطل رائے،صحیح رائے اور مشتبہ رائے،ان تینوں اقسام کو سلف نے اشارہ کیا ہے،رائے صحیح کو استعمال کیا ہے اس پر عمل کیا ہے اور اس پر فتوی دیا ہے، اور اس کو جائز قرار دیا ہے اور باطل رائے کا ذم بیان کرکے اس پر عمل کرنے،اس پر فتوی دینے اور اس پر فیصلہ کرنے سے منع کیا ہے اور رائے اور اہل الرائے کی خوب مذمت کی ہے۔

اور تیسری قسم پر اضطرار کے وقت جب کوئی دوسرا چارہ نہ ہو عمل،فتوی اور قضاء کو جائز قرار دیا ہے اور کسی پر اس پے عمل کرنے کو لازم نہیں سمجھا اور نہ اس کی مخالفت کو حرام کہا ہے اور نہ اس کی مخالف کو دین کا مخالف کہا ہے؛ بلکہ اس کے قبول کرنے اور نہ کرنے میں اختیار دیا ہے،جس طرح حالت اضطرار میں مضطر کے لیے حرام چیز بقدر ضرورت حلال ہوجاتا ہے۔

اس کے بعد غلط و مذموم رائے کی پانچ مختلف قسمیں اور درست رائے کی چار متنوع صورتیں اور متعلقہ تفصیلات ذکر فرمائے ہیں۔

اس سے واضح ہوتا ہے کہ

۱:''رائے'' کوئی ایسا شجرہ ممنوعہ نہیں ہے جو بہرحال مذموم وممنوع ہی ہو۔

۲:اسی طرح یہ بات بھی صاف ہوجاتی ہے کہ سلف صالحین نے جہاں ''رائے'' یا ''اہل رائے'' کی مذمت کی ہے،اس سے ایک مخصوص قسم کی رائے ہی مراد ہے جس کی مذمت بالکل بجا؛ بلکہ دینی حدود کی حفاظت کے لیے ضروری ہے۔

۳:''رائے'' کا استعمال صرف فقہائے حنفیہ یا متاخرین علماء نے ہی نہیں کیا؛ بلکہ سلف کے ہاں اس کا معمول رہا ہے۔علامہ ابن قیم مرحوم کی صراحت کے علاوہ بھی یہ تینوں باتیں ایسی ہیں جن کا کسی منصف مزاج عقل مند شخص سے انکار متصور نہیں ہے۔

رائے کی حیثیت جاننے کی کسوٹی

اب سوال یہ ہوتا ہے کہ ''رائے'' کی کونسی قسم مذموم وممنوع ہے اور کونسی نوع ممدوح ومطلوب؟ ان اقسام کو جاننے کا معیار ومدار کیا ہوگا؟

اس کا جواب یہ ہے کہ مختلف اہلِ علم نے اس پر مختلف انداز میں گفتگو فرمائی ہے، خود علامہ ابن القیم نے درج بالا عبارت کے بعد اس پر بڑے بسط وتفصیل سے روشنی ڈالی ہے؛ تاہم اصولی نقطۂ نظر سے دیکھا جائے تو درج ذیل دو نکات کو سامنے رکھ کر کسی رائے کی حیثیت ومقام معلوم کیا جاسکتا ہے:

الف: ''رائے'' کی بنیاد واساس کیا ہے؟ کیا رائے کی عمارت ایسے امور پر استوار ہے جن کو شرعی دلیل کا درجہ حاصل ہے یا ان کے علاوہ ظن وتخمین اور اتباع ہویٰ وغیرہ ایسے امور پر رائے کی بنیاد کھڑی ہے جن کو شرعی دلیل کا مرتبہ حاصل نہیں ہے؟

ب: ''رائے'' کا مقصود وغرض کیا ہے؟ کیا اس کی بنیاد پر کسی غیر منصوص درپیش مسئلہ کا شرعی حکم دریافت کرنا منظور ہے یا کسی منصوص حکم میں تغیر وتبدیلی کرنی مطلوب ہے؟

اب اگر کوئی رائے ایسی ہو جو درج بالا دو شقوں میں سے پہلی شق کی حامل ہو تو وہ رائے درست ہے، ورنہ تو درست نہیں ہے۔ لہٰذا اس کے مطابق اگر کوئی رائے ایسی ہو جس میں درج بالا دونوں شرطیں پائی جائیں یعنی ایک تو اس کی بنیاد کسی ایسی چیز پر ہو جس کو شرعی نقطۂ نظر سے دلیل کا درجہ حاصل ہو اور اس کے ساتھ یہ بھی ضروری ہے کہ اس کی وجہ سے کسی منصوص حکم کو نہ چھوڑا جائے تو ان دو شرائط کے ہوتے ہوئے جو ''رائے'' ہوگی، وہ قابلِ قدر اور درست ہوگی اور اگر دونوں میں سے کوئی شرط مفقود ہو تو وہ رائے ممنوع ومذموم ہے۔

''اہلِ رائے'' کی اصطلاح کے مختلف استعمالات

اہل علم کی کتابوں میں جہاں ''اہلِ رائے'' کا لفظ استعمال ہوتا ہے، وہاں اس کے سیاق وسباق اور اس کے متقابل ومتضاد پہلو پر غور کرنے کی ضرورت ہے اور ان باتوں کو دیکھ کر ہی اصل مقصود تک رسائی ممکن ہے؛ چنانچہ:

۱: بعض اوقات تو یہ لفظ ان لوگوں کے لیے استعمال ہوتا ہے جو محض اپنے گمان وتخمین سے شرعی احکام ثابت کرنے کی جسارت کرتے ہیں، قرآن وحدیث کی طرف مراجعت کرنے اور وہاں پیش آمدہ مسئلہ کا حکم معلوم کرنے کی زحمت ہی نہیں کرتے۔

۲: بسا اوقات یہ اصطلاح ان بے نصیب قسم کے لوگوں کے لیے استعمال کی جاتی ہے جو قرآن وحدیث کے منصوص مسائل کو بھی اپنی عقل ناتواں کی کسوٹی پر پرکھ کر جانچتے ہیں اور اس پیمانے پر پورا اترنے کے بعد ہی اس کو تسلیم کرنے کی زحمت کرتے ہیں۔

۳: بعض جگہ یہ عنوان ''اہل حدیث'' کے متقابل کے طور پر ان لوگوں کے لیے استعمال ہوتا ہے

جن کو اللہ تعالیٰ نے صرف حدیث کے الفاظ یاد کرنے ہی کی مہارت نہ دی ہو؛ بلکہ ساتھ تفقہ کی عظیم دولت سے بھی نوازا ہو۔

۴: بعض مقامات پر اس کا اطلاق فقہائے کرام کے طبقے میں سے بھی سب پر نہیں ہوتا؛ بلکہ ان میں سے خاص انھیں حضرات پر ہوتا ہے جن کو علمی سطح پر خاص طور پر یہ ذوق نصیب ہوا ہے اور عملی سطح پر وہ اس کے ساتھ زیادہ اعتنار کھتے ہوں۔

اہل رائے کا مصداق

اب پہلے دو معانی کے لحاظ سے یہ عنوان مذمت کا ہے اور جو لوگ اس معنی میں اہل رائے کہلاتے ہیں، وہ گمراہی کے شکار ہیں۔ تیسرے مفہوم کے لحاظ سے یہ اصطلاح چاروں ائمہ مجتہدین کے لیے استعمال ہوتی ہے؛ البتہ امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ کے یہاں چونکہ عام طور پر حدیث کے ظاہر پر عمل ہوتا تھا؛ اس لیے ان کو اس سے مستثنیٰ کیا جاسکتا ہے۔ شاید یہی وجہ تھی کہ امام ابن عبدالبرّ رحمہ اللہ نے فقہائے مجتہدین متبوعین کے حالات پر جو کتاب لکھی، اس میں آپ رحمہ اللہ کا تذکرہ نہیں فرمایا؛ بلکہ اس کا نام ہی یہ رکھا "الانتقاء فی فضائل الائمة الثلاثة الفقهاء"۔ چوتھے استعمال کے لحاظ سے یہ لفظ عام طور پر حضرات فقہائے احناف کے لیے استعمال ہوتا ہے؛ جب کہ بعض اوقات ان کے ساتھ موالک اور بسا اوقات شوافع کو بھی ملایا جاتا ہے۔

بہر حال آخری دونوں مفہوموں کے لحاظ سے اہل رائے کا لفظ لائق تعریف اور قابل مدح ہے، یہ کسی مذمت یا ممانعت کا باعث نہیں ہے۔

خلافت عثمانیہ کے نائب شیخ الاسلام علامہ محمد زاہد کوثری رحمہ اللہ اپنی ایک مفید تحریر ''فقہ اہل العراق'' میں تحریر فرماتے ہیں:

فالرأی بهذا المعنی، وصفٌ مادحٌ یوصف به کل فقیه، ینبأُ عن دقة الفهم، وکمال الغوص. ولذلك تجد ابن قتیبة یذکر فی "کتاب المعارف" الفقهاء بعنوان أصحاب الرأی، ویَعدُّ فیهم الأوزاعی، وسفیان الثوری، ومالك بن أنس رضی اللّٰه عنهم. وکذلك تجد الحافظ محمد بن الحارث الخشنی، یذکر أصحاب مالك فی "قضاة قرطبة" باسم أصحاب الرأی. وهکذا یفعل أیضاً الحافظ أبو الولید بن الفرضی فی "تاریخ علماء الأندلس".

ترجمہ: ''اس معنی کے لحاظ سے ''رائے'' ایک اچھی صفت ہے جس سے ہر فقیہ متصف ہوتا ہے،

جو اچھی فہم اور کمال تجربہ کی دلیل ہے؛ چنانچہ ابن قتیبہ رحمہ اللہ اپنی ''کتاب المعارف'' میں فقہاء کرام کو اصحاب رائے کے عنوان سے ذکر کرتے ہیں، جن میں امام اوزاعی، سفیان ثوری، امام مالک بن انس رحمہم اللہ کو بھی گرادانتے ہیں، نیز امام حافظ محمد بن حارث خشنی رحمہ اللہ اپنی کتاب ''قضاۃ قرطبہ'' میں امام مالک کے اصحاب کو بھی ''اہل الرائے'' کے نام سے ذکر کرتے ہیں، نیز حافظ ابوالولید کا طرز عمل بھی اپنی کتاب تاریخ علماء اندلس میں یہی ہے۔

اس کے کچھ سطر بعد فرماتے ہیں:

وأما تخصيص الحنفية بهذا الاسم، فلا يصح إلا بمعنى البراعة البالغة فى الاستنباط، فالفقه حيثما كان يصحبه الرأى، سواء كان فى المدينة أو فى العراق.(۲)

ترجمہ: ''فقہاء حنفیہ کو خصوصی طور پر اہل الرائے میں سے شمار کرنا بھی کمال استخراج واستنباط کی بنیاد پر ہے، فقہی مسائل کے ساتھ لگاؤ جن کا بھی ہوگا مدینہ میں ہو یا عراق میں وہاں رائے اور اجتہاد کا تذکرہ ہوگا۔''

لیکن علمی دیانت اور اصولی مہارت کے قحط یا فقدان کا کرشمہ ہے کہ ان جیسی اصطلاحات میں خلط ملط سے کام لے کر قابلِ تعریف پہلو لائق مذمت اور باعث مذلت گردانا جاتا ہے اور بعض اوقات اس قدر زور وقوت کے ساتھ یہ اشکال اٹھایا جاتا ہے جس کی وجہ سے مخاطب، حق پر ہونے کے باوجود بھی اس سے شعوری یا غیر شعوری طور پر، برارت کرنے پر ایک گونا مجبور ہوتا ہے۔ اس جہاں کی نیرنگی کا کیا کہیے کہ بسا اوقات کوئی کارِ خیر اور عنوانِ فضل وکمال بھی باعثِ ننگ وعار بن جاتا ہے! حنفیہ کو اہل رائے کیوں کہا جاتا ہے؟ اس حوالہ سے علامہ عبدالعزیز بخاری رحمہ اللہ امام بزدوی رحمہ اللہ سے نقل کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں:

وهم أصحاب الحديث والمعانى أما المعانى فقد سلم لهم العلماء أى سلموها لهم إجمالا وتفصيلا أما إجمالا؛ فلأنهم سموهم أصحاب الرأى تعبيرا لهم بذلك، وإنما سموهم بذلك لإتقان معرفتهم بالحلال والحرام واستخراجهم المعانى من النصوص لبناء الأحكام ودقة نظرهم فيها وكثرة تفريعهم عليها وقد عجز عن ذلك عامة أهل زمانهم فنسبوا أنفسهم إلى الحديث وأبا حنيفة وأصحابه إلى الرأى.(۳)

ترجمہ: اور وہ اصحاب حدیث ومعانی ہیں اور علماء نے ان معانی کو اجمالا اور تفصیلا ان کے سپرد کیا ہے، اسی وجہ سے ان کو اصحاب الرائے کہا گیا ہے اور یہ لوگ اچھی طرح حلال اور حرام کو جانتے ہیں

اور احکام کی بنا کے لیے نصوص سے معانی نکال کر اس میں دقیق نظر کر کے اس پر تفریعات کرتے ہیں اور جب اس سے عام اہل عصر عاجز ہوئے تو اپنی نسبت حدیث کی طرف کیا اور امام ابوحنیفہؒ اور ان کے اصحاب کی نسبت رائے کی طرف کیا اور ان کو اصحاب الرائے کہا۔

کیا قیاس رائے ہے؟

فقہائے کرام کو عموماً اور حضرات حنفیہ کو خاص طور پر جو اہل رائے کہا جاتا ہے، وہ قیاس کے استعمال کرنے اور اس کے ذریعے شرعی احکام کے استنباط واستخراج کرنے کی بنیاد پر کیا جاتا ہے؛ حالانکہ یہ بات تسلیم شدہ ہے اور اصولی کتابوں میں بار بار اس کی تصریح بھی کی جاتی ہے کہ قیاس محض ''مظہرِ حکم'' ہوتا ہے ''مثبت حکم'' نہیں ہوتا، یعنی قیاس کے ذریعے نئے سرے سے کوئی شرعی حکم ثابت نہیں ہوتا؛ بلکہ مقیس میں پہلے سے جو حکم موجود ہوتا ہے، قیاس کے ذریعے اسی کو ظاہر کیا جاتا ہے۔ جب قیاس کی یہ حیثیت تسلیم ہے تو اس کے بعد قیاس کرنے کی وجہ سے اہل رائے کی بنیاد ہی ختم ہوجاتی ہے۔

کیا فقہائے احناف اہل رائے ہیں؟

ایک عرصہ ہوا کہ بعض طبقات کی جانب سے فقہائے احناف کے متعلق دیگر مجتہدین کرام کی بنسبت زیادہ پروپیگنڈہ کیا جاتا ہے اور اہلِ رائے کہہ کر ان کی مذمت کی جاتی ہے؛ حالانکہ درج بالا سطور سے اچھی طرح واضح ہوجاتا ہے کہ خود اہلِ رائے ہونا کوئی مذمت کا متقاضی نہیں ہے؛ لیکن اس کے باوجود حقیقتِ حال یہ ہے کہ جس طرح مجتہدین احناف کے ہاں بعض چیزیں ایسی ہیں جن کی وجہ سے ان کو خصوصی طور پر اہل رائے قرار دیا جاتا ہے، یوں ہی دیگر مجتہدین کرام کے ہاں بھی متعدد ایسی چیزیں موجود ہیں۔ فقہائے احناف کے بالمقابل عام طور پر شوافع کا ذکر آتا ہے اور ان کو حنفیہ کی بنسبت زیادہ عامل بالحدیث گردانا جاتا ہے؛ جب کہ ان کے ہاں بھی متعدد ایسے ضوابط موجود ہیں جن کی وجہ سے وہ حنفیہ کی بنسبت زیادہ اہل رائے قرار دیے جاسکتے ہیں۔

یاد رہے کہ شوافع کو اہل رائے قرار دینے کا مقصد ان کی مذمت کرنا نہیں ہے؛ بلکہ حضرت امام شافعی رحمہ اللہ ہوں یا دیگر مجتہدین کرام، جن کے علم واجتہاد کو امت نے قبول کیا ہے، وہ سب ہمارے سروں کے تاج، امت کا سرمایہ اور بڑی قابلِ قدر ہستیاں ہیں، ہم ان کی گستاخی، مذمت اور بے ادبی سے ہزار بار اللہ تعالیٰ کی پناہ چاہتے ہیں۔ یہاں تو صرف اصولی جائزہ لینا مقصود ہے کہ شوافع کی بنسبت حنفیہ کو اہل رائے کہنا اور ان کی طرف حدیث سے دور ہونے یا حدیث دشمنی کرنے کی نسبت

کرنا بالکل درست نہیں۔

قاضی محبّ اللہ بہاری کی مفید تحقیق

علماءِ ہند میں سے حضرت علامہ قاضی محبّ اللہ بہاری رحمہ اللہ کا اس موضوع پر ایک رسالہ ہے جو تلاش کے باوجود مطبوع یا مخطوط کسی شکل میں تو دستیاب نہیں ہوسکا؛ تاہم علامہ عبدالحئ حسنی رحمہ اللہ نے ''نزہۃ الخواطر'' میں موصوف کے حالات کے ضمن میں اس کا خلاصہ نقل فرمایا ہے۔ اس میں موصوف رحمہ اللہ نے سات (۷) ایسے ضوابط اور وجوہات ذکر فرمائے ہیں جن کی بنیاد پر احناف کا شوافع کی بنسبت زیادہ عامل بالحدیث ہونا اور شوافع کا اہل رائے ہونا واضح ہوتا ہے، وہ سات ضوابط اور وجوہات درج ذیل ہیں:

پہلی وجہ: حنفیہ کے نزدیک عام قطعی ہوتا ہے، چاہے اس کا تعلق قرآن کریم کے ساتھ ہو یا سنت رسول ﷺ کے ساتھ۔ لہٰذا قیاس ورائے کے ذریعہ اس کی تخصیص درست نہیں ہے؛ جب کہ شوافع کے نزدیک وہ ظنی ہوتا ہے اور قیاس کے ذریعے بھی اس میں تخصیص کی جاسکتی ہے۔

دوسری وجہ: حنفیہ کے نزدیک نصِ مطلق کو اپنے اطلاق پر برقرار رکھنا ضروری ہے اور قیاس کے ذریعہ اس کو مقید کرنا جائز نہیں ہے؛ جب کہ شوافع کے نزدیک ایسا کرنا جائز ہے۔

تیسری وجہ: حنفیہ کے نزدیک مرسل احادیث معتبر ہیں اور قیاس ورائے کی بنسبت وہی مقدم ہیں؛ جب کہ شوافع کے نزدیک عام حالات میں مرسل روایات کا اعتبار نہیں ہے اور قیاس ورائے کا درجہ اس سے مقدم ہے۔

چوتھی وجہ: صحابی کی کوئی بات اگر ایسی ہو جو مدرک بالرأی نہ ہو تو حنفیہ کے نزدیک وہ سنت کے ساتھ ملحق ہے اور رائے وقیاس پر بہرحال اس کو مقدم رکھا جائے گا؛ جب کہ شوافع کے نزدیک ایسا نہیں ہے۔

پانچویں وجہ: کسی عبادت میں جزء یا شرط کا اضافہ کرنا شوافع کے نزدیک تخصیص وتقیید ہے، لہٰذا قیاس ورائے کی بنیاد پر بھی ایسا کرنا درست ہے؛ جب کہ حنفیہ کے نزدیک ایسا کرنا اس کی حیثیت نسخ کی ہے، لہٰذا قیاس کا یہاں اعتبار نہیں ہے۔

چھٹی وجہ: حنفیہ کے نزدیک علت کے معتبر ہونے کے لیے ضروری ہے کہ کسی نص یا اجماع سے اس کا مؤثر ہونا ثابت ہو؛ جب کہ شوافع کے نزدیک تاثیر کا ثابت ہونا ضروری نہیں ہے۔

ساتویں وجہ: حنفیہ حدود اور کفارات کے باب میں رائے وقیاس کے قائل نہیں ہیں؛ جب کہ

شوافع کے نزدیک ایسا کرنا درست ہے۔(۴)

آٹھویں وجہ: امام فخر الاسلام بزدوی رحمہ اللہ نے ''اصول بزدوی'' کے مقدمہ میں اس بات کی تفصیل ذکر فرمائی ہے کہ فقہائے حنفیہ اہل رائے ہونے اور اس میں سبقت کا مقام حاصل کرنے کے ساتھ ساتھ حدیث وسنت پر عمل کرنے میں بھی دیگر مجتہدین کی بنسبت زیادہ فائق ہیں، اس ضمن میں ایک وجہ یہ بھی ذکر فرمائی ہے کہ ان کے ہاں مجہول راوی کی روایت قیاس ورائے پر مقدم ہے؛ جب کہ دیگر مجتہدین کے ہاں ایسا نہیں ہے۔ وہ تحریر فرماتے ہیں:

وأصحابنا هم السابقون فی هذا الباب ولهم الرتبة العليا والدرجة القصوى فی علم الشريعة. وهم أولى بالحديث أيضا ألا ترى أنهم جوزوا نسخ الكتاب بالسنة. وقدموا رواية المجهول على القياس.(۵)

ترجمہ: اور ہمارے اصحاب اس باب میں آگے ہیں اور ان کو علم شریعت میں اونچا درجہ اور رتبہ حاصل ہے، اور ان کو حدیث میں بھی مہارت حاصل ہے جیسا کہ انھوں نے کتاب اللہ کو سنت کے ذریعے منسوخ ہونے کو جائز قرار دیا ہے اور مجہول روایت کو قیاس پر مقدم کیا ہے۔

خلاصہ

ان وجوہات سے معلوم ہوا کہ رائے یا اہلِ رائے کا لفظ مطلقاً مذمت کے لیے استعمال نہیں ہوتا اور جن اسباب وضوابط کی بنیاد پر کسی جماعت کو اہلِ رائے قرار دیا جاتا ہے، وہ صرف فقہائے حنفیہ ہی کے ہاں نہیں ہیں؛ بلکہ دیگر فقہائے مجتہدین کے ہاں بھی ایسے مختلف ضوابط پائے جاتے ہیں، یہاں تک کہ فقہائے شافعیہ کے ہاں حنفیہ کی بنسبت ایسی وجوہات کچھ زیادہ موجود ہیں جن کی بنا پر کسی جماعت کو اہل رائے میں سے گردانا جاتا ہے، اگرچہ اس سے فقہائے شافعیہ کی تنقیص، مذمت یا عیب جوئی مقصود نہیں ہے؛ بلکہ ان کے فقہی ذوق کو اجاگر کرنا مطلوب ہے؛ کیونکہ رائے کے بغیر حدیث کے ظاہر ہی کو ہر جگہ مراد لینا کافی نہیں ہوتا۔ امام بزدوی رحمہ اللہ تحریر فرماتے ہیں:

وقال محمد – رحمه الله تعالى – فی كتاب أدب القاضی: لا يستقيم الحديث إلا بالرأى ولا يستقيم الرأى إلا بالحديث حتى أن من لا يحسن الحديث أو علم الحديث ولا يحسن الرأى فلا يصلح للقضاء والفتوى وقد ملأ كتبه من الحديث، ومن استراح بظاهر الحديث عن بحث المعانى ونكل عن ترتيب الفروع على الأصول انتسب إلى ظاهر الحديث.(۶)

ترجمہ: امام محمد رحمہ اللہ نے کتاب ''ادب القضی'' میں لکھا ہے کہ حدیث رائے کے بغیر صحیح نہیں ہوتی اور رائے حدیث کے بغیر صحیح نہیں ہوتی، یہاں تک کہ اگر کوئی حدیث یا علم حدیث اور رائے کو نہیں جانتا ہو اور اس کی کتابیں حدیث سے بھری ہوں پھر بھی وہ قضاء اور فتوی کا اہل نہیں ہے، اور اگر کوئی معانی کی بحث میں ظاہری حدیث سے استدلال کرے اور اصول پر تفریعات کرنے سے انکار کرے تو ان کی نسبت ظاہری حدیث کی طرف ہوگی۔

❊ ❊ ❊

حواشی

(۱) إعلام الموقعين عن رب العالمين، فصل تأويل ما روى عن الصحابة من الأخذ بالرأى، الرأى على ثلاثة أنواع، ج1 ص53.

(۲) فقه أهل العراق وحديثهم، ص32.

(۳) كشف الأسرار شرح أصول البزدوى، العلم نوعان، النوع الثانى علم الفروع وهو الفقه،ج1 ص16.

(۴) نزهة الخواطر وبهجة المسامع والنواظر، ج6 ص793.

(۵) كشف الأسرار شرح أصول البزدوى، العلم نوعان، النوع الثانى علم الفروع وهو الفقه، ج1 ص15.

(۶) كشف الأسرار شرح أصول البزدوى، العلم نوعان، النوع الثانى علم الفروع وهو الفقه، ج1 ص 15.

❊ ❊ ❊

فخرِ ہند علامہ ابوالحسنات عبدالحئیؒ لکھنویؒ
(خاکۂ حیات، کارنامے اور تفردات)

از: مفتی عبیداللہ قاسمی بہرائچی
استاذ دارالعلوم حیدرآباد

فخر ہند فقیہ عصر محدث زماں جامع معقول ومنقول علامہ عبدالحئیؒ فرنگی محلی لکھنوی علیہ الرحمہ نے "التعلیق الممجد" کے مقدمہ میں خودنوشت لکھتے ہوئے صراحت کی ہے کہ ان کی ولادت باسعادت ۲۶/ذی قعدہ بروز سہ شنبہ (منگل) ۱۲۶۴ھ کو ''باندہ'' کے علاقے میں ہوئی، جہاں ان کے والد مدرسہ امیر نواب ذوالفقارالدولہ میں استاذ تھے۔(۱)

نام اور سلسلۂ نسب

علامہ لکھنویؒ نے اپنی متعدد کتب کے تراجم میں خود وضاحت فرمائی ہے کہ میری پیدائش کے ساتویں دن والد محترم نے میرا نام ''عبدالحئیؒ'' رکھا ہے، اور سن بلوغ کے بعد میرے والد صاحب نے میری کنیت ''ابوالحسنات'' رکھی ہے۔(۲) آپ کے والد محترم کا اسم گرامی ملا عبدالحلیم انصاری ہے اور پورا سلسلۂ نسب اس طرح ہے: ''عبدالحئیؒ بن عبدالحلیم بن امین اللہ بن محمد اکبر بن ابوالرحم بن محمد یعقوب بن عبدالعزیز بن محمد سعید بن شہید قطب الدین انصاری سہالوی'' ہے اور یہ سلسلۂ نسب صحابی رسول حضرت ابوایوب انصاری رضی اللہ تک پہنچتا ہے۔(۳)

فرنگی محل کی طرف نسبت

''النافع الکبیر'' میں علامہ لکھنویؒ لکھتے ہیں کہ ہمارے آباء واجداد ''مدینہ منورہ'' سے ''ہرات'' گئے، وہاں سے دہلی آئے، دہلی سے لکھنؤ کے ''سہال'' نامی قصبہ میں منتقل ہوئے، پھر شہرِ لکھنؤ کے ایک محلّہ ''فرنگی محل'' میں آکر آباد ہوئے۔(۴)

شیخ الطاف الرحمٰن صاحب ''احوال علماء فرنگی محل'' میں فرنگی محل کی وجہ تسمیہ بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں، جس کا خلاصہ یہ ہے کہ: مسلم بادشاہوں کے دور کا یہ ضابطہ تھا کہ جو لوگ دارالحرب سے آ کر مسلم علاقوں میں تجارت کرتے تھے، انھیں ایک مدت تک اجازت ملتی تھی، مدت ختم ہونے کے بعد جب وہ واپس ہوتے تو تمام جائیداد غیر منقولہ سرکاری خزانے میں منتقل ہو جاتیں؛ چنانچہ ایک مرتبہ ایک فرانسیسی تاجر بغرض تجارت لکھنؤ آیا اور ایک مکان اپنے لیے بنوایا، مدت ختم ہونے کے بعد وہ چلا گیا اور مکان سرکاری خزانے میں منتقل ہو گیا، یہ مکان اگر چہ محلّہ ''چراغ بیگ'' میں واقع تھا؛ لیکن مشہور حویلی ''فرنگی'' کے متصل تھا، جسے عوام فرنگی محل کہتی تھی، بعد میں اسے اس نام سے اتنی شہرت حاصل ہوتی گئی کہ محلّہ کا نام بھی فرنگی محل ہو گیا۔(۵) اس مبارک و باسعادت محلے میں ۲۰۰/ سے زائد فقہاء، محدثین، مفسرین، اہل لغت، مناطقہ، فلاسفہ اور دیگر علوم کے ماہرین پیدا ہوئے۔(۶)

تعلیم وتربیت

اللہ نے آپ کو علم دوست اور دینی وعلمی گھرانے میں پیدا فرمایا اور اسی دینی ماحول میں اپنے والد کے زیر سایہ تربیت پائی، بچپن ہی سے تحصیل علم کا آغاز کر دیا، اپنا علمی سفر بیان کرتے ہوئے خود لکھتے ہیں: بچپن ہی سے میرا حافظہ بہت مضبوط تھا، مجھے بچپن کی باتیں اس طرح یاد ہیں جیسے میں نے ابھی دیکھی ہوں؛ حتی کہ تین سال کی عمر کے بھی بعض واقعات مجھے یاد ہیں، پانچ سال کی عمر میں حافظ قاسم علی لکھنویؒ کے پاس حفظ قرآن شروع کیا، ابھی پارہ ''عم یتساءلون'' مکمل نہیں ہوا تھا کہ والدین کے ساتھ جونپور جانا پڑا، وہاں میں نے حافظ ابراہیم کے پاس قرآن پڑھا، اس دوران فارسی کی بعض کتابیں پڑھیں، لکھنا سیکھا اور تکمیل حفظ کے وقت میری عمر دس سال تھی؛ چنانچہ دس سال ہی کی عمر میں تراویح میں قرآن سنایا۔

لکھتے ہیں کہ گیارہ سال کی عمر سے علوم وفنون کی کتابیں پڑھنی شروع کیں اور سترہ سال کی عمر میں ہی تمام درسی کتابیں نحو، صرف، معانی، بیان، حکمت، طب، فقہ، اصول فقہ، حدیث، تفسیر اور علم کلام وغیرہ پڑھ کر فارغ ہو گیا، یہ تمام کتابیں میں نے والد صاحب سے پڑھیں؛ البتہ والد محترم کے انتقال کے بعد علم ریاضی والد صاحب کے ماموں اور ان کے استاذ مولانا محمد نعمت اللہ صاحب سے پڑھی اور حساب والد صاحب کے شاگرد رشید، ان کے سفر وحضر کے رفیق مولوی محمد خادم حسین مظفر پوری سے سیکھا۔ فرماتے ہیں کہ بچپن ہی سے مجھے درس وتدریس اور تصنیف تالیف سے بڑی دلچسپی تھی؛ اس لیے میں جو کتاب بھی پڑھتا، اسے پڑھاتا بھی تھا، اس طرح مجھے تمام علوم میں پختگی حاصل

ہوگئی اور کسی بھی فن کی کتاب میرے لیے مشکل نہیں رہی (۷)

علمی انہماک

جس شخصیت نے سترہ سال کی عمر میں حفظ قرآن کے ساتھ تمام درسی کتب: نحو وصرف، فلسفہ و منطق، حکمت وطب، تفسیر وفقہ اور علمِ حدیث وغیرہ مکمل کرلی ہو اور ۳۹ رسال کے مختصر عرصہ میں مختلف موضوعات پر بے نظیر کتابیں تصنیف کی ہو، اس کا علمی انہماک یقیناً قابل قدر اور لائق درس وعبرت ہوگا؛ چنانچہ عارف باللہ حضرت مولانا قاری صدیق احمد صاحب باندوی رحمہ اللہ "آداب المتعلمین" میں علامہ عبدالحئی لکھنویؒ کے علمی انہماک کا ایک واقعہ بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> حضرت مولانا عبدالحئی فرنگی محلیؒ رحمہ اللہ ایک روز کمرے میں مطالعہ کررہے تھے کہ دوران مطالعہ پانی طلب کیا، ان کے والد حضرت مولانا عبدالحلیم صاحب تشریف فرما تھے، ان کو فکر ہوئی کہ مطالعہ کے درمیان ذہن کسی اور طرف کیسے گیا؟ معلوم ہوتا ہے کہ یہ نہ پڑھے گا، حکم دیا کہ بجائے پانی کے ارنڈی کا تیل جو وہاں رکھا تھا دے دیا جائے، مولانا عبدالحئی صاحبؒ نے گلاس منہ میں لگایا اور تیل پی گئے اور یہ احساس نہ ہوا کہ تیل ہے یا پانی، اس کے بعد پھر مطالعہ میں مشغول ہوگئے، ان کے والد کی فکر دور ہوئی اور کہا امید ہے کہ پڑھ لے گا، والد صاحب چوں کہ بہت بڑے طبیب تھے اس لیے صاحب زادے کو دوا پلا کر تیل کا اثر زائل کیا (۸)

علامہ لکھنویؒ کی وسعت علمی

اللہ تبارک وتعالی نے آپ کو نحو وصرف، منطق وفلسفہ، جدل ومناظرہ، عقائد وکلام، تاریخ و تراجم، معانی و بیان، حکمت وطب، تفسیر واصول تفسیر، فقہ واصول فقہ، حدیث واصول حدیث میں بڑی مہارت اور مکمل دسترس عطا فرمائی تھی، جس موضوع پر بھی آپ نے قلم اٹھایا، اس کا حق ادا کردیا، خوب سیر حاصل بحث کی اور موضوع کو کہیں سے بھی تشنہ نہیں چھوڑا۔ ویسے ہر موضوع پر آپ کی کوئی نہ کوئی دلچسپ اور شاہکار تصنیف ہے؛ لیکن سب سے زیادہ فقہ سے متعلق تصانیف ہیں اور ہر کتاب ایک نایاب گوہر اور اپنے موضوع پر منفرد ہے۔ ان کی کتب اور رسائل کا مطالعہ کرنے والا حیرت میں پڑ جاتا ہے کہ اس وقت نہ تو کمپیوٹر، نہ موبائل اور نہ انٹرنیٹ کا زمانہ تھا اور نہ ہی کتب خانوں سے آسانی کتابیں دستیاب تھیں، اکثر کتابیں غیر مطبوعہ اور مخطوطات کی شکل میں تھیں، ان سب کے باوجود بکثرت ایسی نادر اور کمیاب کتابوں کے حوالے ہیں جن کا دستیاب ہونا آج کے اس ترقی یافتہ

دور میں بھی مشکل ہے، معلوم ہوتا ہے کہ کتابوں کا حیرت انگیز ذخیرہ اکٹھا کر رکھا تھا۔

شیخ عبدالفتاح ابوغدہ لکھتے ہیں:

> علامہ عبدالحئی لکھنویؒ کی کتابوں کا مطالعہ کرنے والا اس بات کے اعتراف پر مجبور ہوتا ہے کہ وہ واضح کامل علمی تصنیفات ہیں جو فیصلہ کن نادر حوالوں اور مسئلۂ باب کے ہر ہر جزئیہ کے استیعاب سے مزین و مرصع ہیں؛ گویا انھوں نے ساری عمر اسی زیرِ بحث موضوع میں کھپا دی تھی۔(۹)

علمی تصانیف

علامہ لکھنویؒ کا شمار کثیر التصانیف علماء میں ہوتا ہے؛ اس لیے کہ آپ نے کہ ۳۹ رسال کی مختصر مدت میں سو سے زائد شاہکار علمی رسائل اور کتابیں تحریر فرمائیں، یقیناً یہ قابل قدر کارنامہ ہے کہ جس عمر میں لوگوں کا علم پختہ ہونا شروع ہوتا ہے اور علمی تحریریں معرض وجود میں آنا شروع ہوتی ہیں، اس عمر میں آپ نے اتنی کتابیں تصنیف فرمائیں!

آپ کی تصانیف کے سلسلے میں سوانح نگاروں اور حالات قلمبند کرنے والے علماء کی مختلف آراء ہیں، علامہ لکھنویؒ نے خود ''سعایہ'' اور "التعليق الممجد" کے مقدمہ وغیرہ میں اپنی ۶۰ رسے زائد تصانیف کا تذکرہ کیا ہے، اس کے بعد لکھا ہے کہ اس کے علاوہ بکثرت حاشیے اور کتابیں ابھی زیر تصنیف ہیں۔(۱۰) معلوم ہوا کہ اور بھی بکثرت تصانیف ہیں؛ چنانچہ علامہ عبدالحئی حسنیؒ نے ''نزہۃ الخواطر'' میں ۹۰ رکتب،(۱۱) آپ کے ایک شاگرد محمد حفیظ اللہ بندوی صاحب نے ''کنز البرکات'' میں ۹۴ رکتب،(۱۲) ایک دوسرے شاگرد محمد عبدالباقی صاحب نے ''تکملۃ خیر العمل'' میں ۱۱۲ رکتب،(۱۳) مولانا محمد عنایت اللہ صاحب فرنگی محلیؒ نے ''تذکرہ علماء فرنگی محل'' میں ۱۰۹ رکتب،(۱۴) اور شیخ العرب والعجم حضرت مولانا ابوالحسن علی میاں حسنی ندویؒ نے ''المسلمون فی الہند'' میں ۱۱۰ کتب کا تذکرہ کیا ہے؛ جب کہ علامہ لکھنویؒ کے مداح اور ان کی متعدد کتب اور رسائل پر تحقیقی کام کرنے والے شیخ عبدالفتاح ابوغدہؒ نے "سباحة الفكر في الجهر بالذكر" کے مقدمہ میں لکھا ہے کہ علامہ لکھنوی علیہ الرحمہ کی تصانیف تقریباً ۱۱۵ رہیں،(۱۵) اور "الرفع والتكميل في الجرح والتعديل" کے مقدمہ میں علامہ لکھنویؒ کے حوالے سے نام بنام ایک سو سات کتابوں کو ذکر کیا ہے،(۱۶) اسی طرح ڈاکٹر ولی الدین ندویؒ نے اپنی کتاب ''علامہ عبدالحئی لکھنوی فرنگی محل حیات و خدمات'' میں ۱۱۹ رمؤلفات نام بنام ذکر کی ہیں۔(۱۷)

خلاصۂ کلام یہ ہے کہ آپ کی تصانیف کی تعداد سو سے متجاوز ہے اور اختلاف کا بظاہر سبب یہ ہے کہ علامہ لکھنویؒ نے خود اپنے احوال میں بہت ساری تصانیف کا تذکرہ نہیں کیا؛ کیوں کہ بہت ساری کتابیں زیر تصنیف تھیں، معرض وجود میں نہیں آئی تھیں، اسی طرح بہت ساری کتابوں تک سوانح نگار حضرات کی بھی رسائی نہیں ہوسکی؛ اس لیے ہر ایک نے اپنی اپنی تحقیق کے اعتبار سے تصانیف کا تذکرہ کیا ہے۔

چار شاہکار مؤلفات

مولانا محمد عنایت اللہ صاحب فرنگی محلیؒ ''تذکرہ علماء فرنگی محل'' میں علامہ لکھنویؒ کی تصانیف کا تذکرہ کرنے کے بعد لکھتے ہیں:

> ان تالیفات کے بارے میں صرف اس قدر لکھنا چاہتا ہوں کہ اگر مولانا کی کوئی اور تصنیف نہ ہوتی اور صرف چار کتابیں آپ کی مؤلفہ ہمارے ہاتھ میں ہوتیں، تب بھی مولانا کی عظمتِ شان اور مرتبۂ علمی جاننے کے لیے کافی تھیں۔ یہ چار کتابیں چار فنون مختلفہ کی ہیں: ایک ''مصباح الدجیٰ'' یعنی حاشیہ غلام یحیٰ بر میر زاہد رسالہ کا مبسوط حاشیہ جو مولانا کی وسعت نظر اور قوت علمی اور منطق میں بے مثل محقق ہونے کا گواہ ناطق ہے۔ دوسرے ''سعایہ'' یعنی شرح وقایہ کا حامل المتن حاشیہ، امیر اتقانی نے حاشیۂ ہدایہ کے متعلق جو کچھ اپنے قلم سے لکھا ہے وہ سب مولانا کی اس کتاب کے متعلق کہا جاسکتا ہے اور صحیح طور پر کہا جاسکتا ہے۔ اگر اس کتاب کو علامہ صدر الشریعہ دیکھتے تو وہ مولانا کے ہاتھوں کو محبت سے چوم لیتے، اگر یہ کتاب تمام ہوجاتی تو یقیناً علمائے زمانہ ''البحر الرائق'' اور ''فتح القدیر'' کو بھول جاتے۔ تیسرے ''موطا امام محمد'' کا مبسوط حاشیہ یعنی "التعلیق المججد" اس حاشیہ کی کیا تعریف کی جائے سوائے اس کے کہ علمائے متاخرین میں اس کی کوئی نظیر ''عمدۃ القاری'' کے بعد نہیں ہوئی۔ (بحث صرف محققانہ تحریر سے ہے) اور بے تعصبی اور ''الحق احق بالاتباع'' کے اعتبار سے کسی آخری دور کے عالم کا آپ سے مقابلہ ہی نہیں کیا جاسکتا۔ چوتھے ''ظفر الامانی'' اصول حدیث میں بے مثل رسالہ ہے یہ اگرچہ رسالہ سید شریف کی شرح ہے؛ مگر حق یہ ہے کہ وہ خود ایک مستقل تالیف ہے اور اس کے بعد ''مقدمہ ابن الصلاح'' کی بھی ضرورت طالبان علم کے لیے باقی نہیں رہتی۔(۱۸)

علامہ لکھنویؒ حنفی المسلک تھے

علماء نے صراحت کی ہے اور خود علامہ عبدالحئی لکھنوی علیہ الرحمہ کے رسائل اور کتب اس بات پر شاہد ہیں کہ وہ اصولاً اور فروعاً مسلک احناف کے پابند تھے؛ چنانچہ انھوں نے احناف کی متعدد کتب فقہ پر تحقیق وتعلیق کا کام کیا ہے، فقہ حنفی کے مطابق متعدد کتب اور رسائل لکھے ہیں اور اپنے فتاوی بھی فقہ حنفی کے مطابق صادر کیے ہیں، جن کا مجموعہ خلاصۃ الفتاویٰ کے نام سے کئی جلدوں میں شائع ہوا ہے، مزید یہ کہ وہ خود اپنے ایک رسالہ "القول المنشور في هلال خير الشهور" میں اپنا تعارف کراتے ہوئے لکھتے ہیں: "اللّكنوي وطنا، الأنصاري الأيوبي القطبي نسباً، الحنفي مذهبًا ومشربًا" وطن کے اعتبار سے لکھنوی، نسب کے اعتبار سے ایوبی قطبی اور مسلک ومشرب کے اعتبار سے حنفی۔(۱۹)

البتہ وہ مقلد محض نہیں تھے، ان کی تحقیق اگر قرآن وحدیث کی روشنی میں کسی مسئلہ میں احناف کے خلاف ہوتی، تو دوسری رائے اختیار کر لیتے، ان کے معاصر اور ہم نام علامہ عبدالحئی حسنیؒ لکھتے ہیں: علامہ لکھنویؒ اصول وفروع میں مسلک احناف کے پابند تھے؛ لیکن متعصب اور متشدد نہ تھے، دلیل کا اتباع کرتے اور اگر کسی مسئلہ میں خلاف مسلک کوئی صریح نص پاتے تو تقلید نہ کرتے۔(۲۰)

خود علامہ لکھنویؒ نے بھی وضاحت کرتے ہوئے لکھا ہے:

ومن مِنَحِه عليّ رُزِقتُ التوجه إلى فن الحديث و فقه الحديث، ولا اعتمد على مسئلة مالم يوجد أصلها من حديث أو آية، و ما كان خلاف الحديث الصحيح الصريح أتركه، وأظن المجتهد فيه معذورا بل مأجورا..... ومن منحه أنه جعلني سالكا بين الإفراط و التفريط، لا تأتى مسئلة معركة الآراء بين يديّ إلا ألهمت الطريق الوسط فيها، ولست ممن يختار طريق التقليد البحت بحيث لا يترك قول الفقهاء وإن خالفته الأدلة الشرعية، ولا ممن يطعن عليهم و يجهر الفقه بالكلية.(۲۱)

ترجمہ: اللہ کا مجھ پر انعام ہے کہ اس نے مجھے فن فقہ وحدیث میں رہنمائی عطا فرمائی ہے، میں کسی مسئلہ پر اس وقت تک اعتماد نہیں کرتا؛ جب تک اس کی اصل قرآن یا حدیث میں موجود نہ ہو، جو مسئلہ حدیث صریح کے خلاف ہوتا ہے میں اسے چھوڑ دیتا ہوں اور مجتہد کو معذور؛ بلکہ قابل ثواب سمجھتا ہوں.... اور اللہ کا مجھ پر ایک انعام یہ بھی ہے کہ اس نے مجھے افراط وتفریط کے درمیان معتدل مزاج والا بنایا، کوئی بھی معرکۃ الآراء مسئلہ میرے سامنے آتا ہے، تو مجھے اعتدال کا راستہ الہام کیا جاتا ہے،

میں ان لوگوں میں سے نہیں ہوں جو خالص تقلید کا راستہ اختیار کرتے ہیں اور دلیل شرعی کے خلاف بھی فقہاء کا قول نہیں چھوڑتے اور نہ ان لوگوں میں سے ہوں جو فقہاء کو برا بھلا کہتے ہیں اور فقہ کو بالکلیہ چھوڑ دیتے ہیں۔

علامہ لکھنویؒ کے بعض تفردات

بعض مسائل میں علامہ لکھنویؒ نے احناف کے خلاف رائے اختیار کی ہے، جنھیں ان کے تفردات میں شمار کیا جاتا ہے۔ مثلاً: (۱) احناف کے خلاف رفع یدین[۲۲] (۲) اور آمین بالجہر[۲۳] کو راجح قرار دینا، (۳) عقیقہ کو مباح کے بجائے مسنون اور مستحب کہنا[۲۴] (۴) اقل مہر کو مطلق رکھنا (دس درہم کی تعیین نہ کرنا)[۲۵] (۵) سفر، بارش یا کسی عذر کی صورت میں دو نمازوں کو جمع کرنا[۲۶] (۶) سورہ حج میں دو آیت سجدہ کا ہونا[۲۷] (۷) نماز جنازہ میں سورۂ فاتحہ کا پڑھنا[۲۸] (۸) حالت احرام میں نکاح کا ممنوع ہونا[۲۹] (۹) کانوں کے مسح سے پہلے سر کے ساتھ ہی گردن کا مسح کرنا، وہ بھی الٹے ہاتھ کے بجائے سیدھے ہاتھ سے گردن کا مسح کرنا[۳۰] (۱۰) اور شرمگاہ چھونے سے وضو کا ٹوٹ جانا[۳۱] یہ دس مسائل ذکر کیے گئے ہیں جن میں علامہ لکھنوی علیہ الرحمہ نے احناف کے خلاف موقف اختیار کیا ہے، ان کے علاوہ اور بھی متعدد مسائل ہیں جن میں علامہ لکھنویؒ نے اختلاف کیا ہے۔

علامہ لکھنویؒ علماء کی نظر میں

علامہ لکھنویؒ کی شہرت نہ صرف یہ کہ برصغیر ہند و پاک اور عجمی ممالک میں محدود تھی؛ بلکہ عالم عرب میں بھی آپ کو بڑی پذیرائی اور مقبولیت ملی اور ہر ایک نے آپ کو سراہا اور آپ کے علمی مقام و مرتبہ کو تسلیم کیا۔

الشیخ محمد عبداللہ حنبلیؒ

علامہ کے استاد شیخ محمد عبداللہ حنبلیؒ آپ کے بارے میں لکھتے ہیں:

> احادیث نبویہ کا اس درجہ استحضار، نصوص فقہیہ کا اتنا واضح تصور اور مختلف علوم وفنون، منطق ومفہوم میں وہ تحقیقات وتدقیقات ہیں جن سے میری آنکھیں ٹھنڈی ہوگئیں اور دل فرحاں وشاداں ہوگیا[۳۲]

علامہ زاہد کوثریؒ

علامہ زاہد کوثری لکھتے ہیں:

> علامہ عبدالحئی لکھنویؒ اپنے زمانے میں احادیث احکام کے سب سے بڑے عالم تھے[۳۳]

شیخ عبدالفتاح ابوغدہؒ

شیخ عبدالفتاح ابوغدہؒ جنھوں نے علامہ لکھنویؒ کی متعدد کتب پر تحقیقی کام کیا ہے وہ لکھتے ہیں:

علامہ لکھنویؒ فخر متاخرین، انصاف پسند محققین میں یکتا، محدث، فقیہ، اصولی، ماہر فلسفہ، متکلم مؤرخ اور محقق ونقاد ہیں (۳۴)

علامہ یوسف بنوریؒ

جامع المنقول والمعقول علامہ یوسف بنوری علیہ الرحمہ تعریف وتوصیف بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

علامہ عبدالحئی لکھنویؒ بھی ان علماء ربانیین میں شامل ہیں جو ورع وتقوی، عبادت و ریاضت، علوم روایت ودرایت اور منقولات ومعقولات کے جامع ہیں (۳۵)

شیخ علامہ عبدالحئی حسنیؒ

آپ کے معاصر اور ہمنام مؤرخ علامہ عبدالحئی حسنیؒ لکھتے ہیں:

وہ ذہین وفطین، پاکدامن، متواضع، ماہر خطیب، منقولات ومعقولات کے بحر بیکراں، اسرار شریعت سے واقف، ہندوستان میں فقہ وفتاوی میں منفرد ویکتا تھے، ان کا شہرہ اور چرچہ دور دور تک تھا، ہر ملک اور علاقے کے علماء ان کی جلالت شان کے معترف تھے (۳۶)

شیخ ابوالحسن علی میاں ندویؒ

حضرت مولانا ابوالحسن علی میاں ندویؒ لکھتے ہیں۔

وہ علامہ، ہنداور فخر متاخرین ہیں (۳۷)

وفات

والد ماجد حضرت مولانا عبدالحلیم صاحبؒ کی وفات سے قبل حیدرآباد دکن کے مدرسہ نظامیہ میں تدریسی خدمات انجام دیتے رہے، ان کی وفات کے بعد علامہ لکھنویؒ حیدرآباد سے اپنے وطن تشریف لے آئے اور وہیں مستقل رہ کر علمی خدمات شروع کردیں اور اس قدر محنت کی کہ صحت خراب ہوگئی اور مستقل بیمار رہنے لگے، جب بھی کچھ افاقہ ہوتا علمی کام میں مشغول ہوجاتے جس سے طبیعت مزید بگڑ جاتی۔ ۱۳۰۳ھ کے وسط میں کھانسی، دمہ اور بیہوشی کا مرض شروع ہوگیا اور غشی کے دورے پڑنے لگے، ماہر ڈاکٹروں کے علاج سے بھی افاقہ نہیں ہوا، بالآخر ۳۰؍اور بعض کے بقول ۲۹؍ربیع الاول بروز دوشنبہ ۱۳۰۴ھ کو نصف شب کے قریب غشی کا دورہ شروع ہوا اور دومرتبہ افاقہ بھی ہوگیا؛ لیکن تیسری

مرتبہ کے دورہ میں یہ آفتاب علم و ماہتاب، فخر الہند اور علوم فقہ وحدیث کا بحر بیکراں محض ۳۹ رسال کے قلیل عرصے میں اپنے مالک حقیقی سے جاملا۔ إنا للّٰه وإنا إليه راجعون انتقال کے بعد محبین اور عوام الناس کا سیلاب امڈ پڑا؛ اس لیے باری باری تین علماء: مولانا عبدالرزاق صاحبؒ لکھنوی، مولانا عبد الوہاب صاحب اور مولانا عبدالمجید صاحب نے نماز جنازہ پڑھائی اور تدفین آبائی قبرستان ''باغ انوار الحق'' میں ہوئی۔(۳۸)

❋ ❋ ❋

حوالہ جات

(۱) مقدمة السعاية للعلامة عبد الحي اللكهنوي، ص: ٤١ = التعليق الممجد للعلامة عبد الحي اللكهنوي، ١/١١٠، ط: دارالسنة والسيرة بومبائی، دارالقلم دمشق.

(۲) مقدمة السعاية، ص: ٤١ = التعليق الممجد: ١/١٠٨، ط: دارالسنة والسيرة بومبائی، دارالقلم دمشق.

(۳) النافع الكبير لمن يطالع الجامع الصغيرللعلامة عبد الحي اللكهنوي: ص:٦٠، ط: ادارة القرآن والعلوم الاسلامية باكستان كراتشی.

(۴) النافع الكبير لمن يطالع الجامع الصغير: ص:٦٠، ط: ادارة القرآن والعلوم الاسلامية باكستان كراتشی.

(۵) احوال علماء فرنگی محل للشيخ الكاف الرحمن باره بنكوی، ص: ١١.

(۶) تذكره علماء فرنگی محل لمولانا محمد عنايتؒ الله فرنگی محل.

(۷) مقدمة السعاية، للعلامة عبد الحي اللكهنوي ص: ٤١.

(۸) آداب المتعلمين للمقري صديق احمد باندويؒ، ص:٤٠، مكتبه حكيم الامت سهارنپور انڈيا.

(۹) مقدمة التعليقات الحافلة على الأجوبة الفاضلة للشيخ عبد الفتاح ابو غدة، ص: ١١٤.

(۱۰) مقدمة السعاية، ص:٤٢= التعليق الممجد للعلامة عبد الحي اللكهنوي: ١/١١٠،١١١، ط: دارالسنة والسيرة بومبائی، دارالقلم دمشق.

(۱۱) نزهة الخواطر للشيخ عبد الحي الحسني، ٨/٢٣٧-٩٣٩، بحواله: الامام عبد الحئی اللكنوي للدكتور ولي الدين الندوي، ص: ١٦١، ط: دارالقلم دمشق.

(۱۲) كنز البركات للشيخ محمد حفيظ الله بندوي، ص:٢١-٢٤، بحواله: الامام عبد الحئی اللكنوي للدكتور ولي الدين الندوي، ص: ١٦١، ط: دارالقلم دمشق.

(۱۳) تكملة خير العمل بذكر علماء فرنكی محل، ص: ٤٢، بحواله: الامام عبد الحئی اللكنوي للدكتور ولي الدين الندوي، ص: ١٦١، ط: دارالقلم دمشق.

(۱۴) تذكره علماء فرنگی محل، لمولانا محمد عنايتؒ الله فرنگی محل، ص:١٣٤، ط: اشاعة العلوم فرنگی محل لكهنؤ.

(۱۵) مقدمة "سباحة الفكر في الجهر بالذكر"، ص: ٥، ط: دارالسلام للطباعة و النشرو التوزيع والترجمة.

(۱۶) مقدمة"الرفع والتكميل في الجرح والتعديل للعلامة عبد الحي اللكهنوي"، ص: ٢٢تا ٢٧، ط: شركة دارالبشائر الإسلامية بيروت.

(۱۷) الامام عبد الحئی اللكنوي للدكتور ولي الدين الندوي، ص: ١٦٥، ط: دارالقلم دمشق.

(۱۸) تذكره علماء فرنگی محل لمولانا محمد عنایتؒ اللّٰه فرنگی محل، ص:۱۳۵، ط: اشاعة العلوم فرنگی محل لکهنؤ

(۱۹) القول المنشور في هلال خير الشهور، ص: ۳، مجموعه رسائل اللكنوى، ۲/ ۳۱۰، ط: ادارة القرآن كراتشي، المكتبة الإمدادية مكة المكرمة.

(۲۰) نزهة الخواطر للشيخ عبد الحي الحسني، ۸/ ۲۳۵، بحواله: الامام عبد الحئى اللكنوي للدكتور ولي الدين الندوي، ص: ۱٦۱، ط: دارالقلم دمشق.

(۲۱) النافع الكبير لمن يطالع الجامع الصغير للعلامة عبد الحي الكهنوي، ص:٦٥، ط: ادارة القرآن والعلوم باكستان كراتشى.

(۲۲) التعليق المججد، على موطا امام محمد للعلامه عبد الحي اللكنوي، باب آمين في الصلاة، ص: ۳۸۸/۱، ط: دارالسنة والسيرة بومبائى، دارالقلم دمشق.

(۲۳) حواله سابق ٤٤٦/۱.

(۲۴) حواله سابق، ٦٥٧/۲.

(۲۵) حواله سابق، ۲/ ٤٥٤.

(۲٦) حواله سابق، ۱/ ٥٧٠ = ٥٧٢/۲.

(۲۷) حواله سابق، ۲٤/۲.

(۲۸) حواله سابق، ۲/ ۱۱۲،۱۱۳.

(۲۹) حواله سابق، ص: ۳۲۳/۲.

(۳۰) السعاية للعلامة عبد الحي اللكهنوي، ص: ۱۷۸، المطبع المصطفائى.

(۳۱) حواله سابق، ص: ۲٦۷،۲٦۸.

(۳۲) مقدمة الكوثرى على نصب الراية للزيلعى، ص: ٤۹)

(۳۳)التعليقات الحافلة على الاجوبة الفاضلة للاسئلة العشرة الكاملة للشيخ عبد الفتاح ابو غدة، ص: ۱۲.

(۳۴)حسرة الفحول بوفات نائب الرسول، ص:۸، بحواله: الامام عبد الحئى اللكنوي للدكتور ولي الدين الندوي، ص:۸٤، ط: دارالقلم دمشق.

(۳۵) السعاية فى كشف ما فى شرح الوقاية، ص: ۱.

(۳٦) نزهة الخواطر للشيخ عبد الحي الحسني، ۸/ ۲۳۵، بحواله: الامام عبد الحئى اللكنوي للدكتور ولي الدين الندوي، ص: ۱٦۱، ط: دارالقلم دمشق.

(۳۷) المسلمون في الهند للشيخ على مياں الندوي، ص: ٦.

(۳۸) تذكره علماء فرنگی محل، ص: ۱۳۲، ط: اشاعة العلوم فرنگی محل لکهنؤ = الامام عبد الحئى اللكنوي للدكتور ولي الدين الندوي، ص: ۷۹، ۸۰، ط: دارالقلم دمشق = احوال علماء فرنگی محل، ص: ٦٤.

❊ ❊ ❊

''تذکرۃ الرشید'' کا علمی وادبی مطالعہ

(۲/۱)

بقلم: ڈاکٹر مولانا اشتیاق احمد قاسمی
مدرس دارالعلوم دیوبند

''علمائے دیوبند'' میں حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ فقیہ النفس اور بڑے نمایاں اوصاف کے حامل ہیں، وہ بیک وقت محدث، مصنف، مدرس، مجاہد، مناظر، صوفی، مصلح، حکیم اور محبّ رسول ﷺ تھے، موصوف کی زندگی میں بڑے مراحل آئے جن میں اُن کے نام لیواؤں کے لیے دُروس ہیں۔

''تذکرۃ الرشید'' حضرت کی سوانح ہے اور دوجلدوں میں بڑی مفصل ۵۹۶ صفحات پر مشتمل ہے، ۱۳۲۶ھ/۱۹۰۸ء کو صرف دو مہینے میں لکھی گئی، مکتبہ عاشقیہ میرٹھ سے شائع ہوئی۔ ہر عقیدت کیش کو تفصیل سے پڑھنے کا موقع نہیں—؛ حالاں کہ سوانح نگار مولانا عاشق الٰہی میرٹھیؒ بڑے اونچے قلم کار ہیں، ان کے اسلوب میں تصویر کشی اور منظر نگاری بڑی پرکشش ہوتی ہے، اشعار کا آمیزہ بڑا لطف دیتا ہے— اس لیے جی میں آیا کہ اس کا سینٹیفک (علمی) تنقیدی تجزیہ پیش کیا جائے؛ تاکہ قارئین ایک نظر میں پوری سوانح کا خلاصہ ذہن نشیں کرلیں۔ وباللہ التوفیق!

کتاب قدیم طرز پر لکھی گئی ہے، فہرست مضامین نہیں ہے؛ اس لیے مضمون تلاشنا اور اپنی مرضی کے اجزاء کا پڑھنا مشکل ہے، اسی طرح مرکزی عناوین کے ساتھ ذیلی عناوین نہیں ہیں، نئی باتوں اور الگ الگ واقعات کے لیے صرف پیراگراف بدلنے پر اکتفا کیا گیا ہے؛ اس لیے اس کی افادیت قدرے کم ہے، صرف باہمت افراد ہی استفادہ کرسکتے ہیں۔

افتتاحیہ کا طرز: پرانے مصنّفین اپنی کتابوں کو خطبہ سے شروع فرماتے اور سب سے پہلے اپنا مختصر تعارف لکھتے ہوئے مقصدِ تصنیف کو واضح فرماتے تھے، سببِ تصنیف کی وضاحت اس میں شامل ہوتی تھی، پھر اصل مقصد اور مدعا کی ابتدا فرماتے، اگر اس کے لیے کسی تمہید یا مقدمہ کی ضرورت ہوتی تو اس کو لکھنے کے بعد اصل مقصد پر آتے تھے۔

''تذکرۃ الرشید'' میں بھی یہی اسلوب اپنایا گیا ہے، یہی اسلوب اس وقت رائج تھا، ایک صدی پہلے اس کو قبول حاصل تھا؛ اس لیے ''تذکرۃ الرشید'' کے مؤقر سوانح نگار نے اس انداز کو اختیار فرمایا تھا۔ زبان و بیان، الفاظ و تراکیب میں آج بھی تازگی محسوس ہوتی ہے، ایک سو سال کے بعد بھی وہی چاشنی باقی ہے، یہ اس وجہ سے ہے کہ موصوف زندہ زبان لکھنے کے عادی تھے، جمالیاتی عناصر کی آمیزش سے مضمون دوآتشہ نظر آتا ہے۔

سوانح کی شروعات تو اُسی انداز سے ہوئی ہے، جس انداز سے ایک عقیدت کیش اپنے محبوب کا ذکر کرتا ہے، بہت سے اوصافِ جمیلہ بیان کرنے کے بعد لکھتے ہیں:

فدا ہو آپ کی کس کس ادا پر ادائیں لاکھ اور بے تاب دل ایک

(تذکرۃ الرشید ۱/۳)

مگر اس میں غلو نہیں ہے، عبارت آرائی تو ہے؛ مبالغہ آرائی نہیں ہے۔ شہادت کے لیے سوانح کی دونوں جلدیں حاضر ہیں راقم ان سے متعدد واقعات اور مثالیں نقل کرے گا جس سے اس کا اندازہ کرنا مشکل نہ ہوگا۔

تصنیف کا محرک: سوانح نگار کو سوانح نویسی کا اصرار بہت سے لوگوں نے کیا؛ مگر سب سے زیادہ حضرت مولانا محمد یحییٰ کاندھلویؒ اور حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ کا اصرار مؤثر ہوا یہی گویا تصنیف کا محرک اور سبب یہی بنا۔ (تذکرۃ الرشید ۱/۳-۴)

تصنیف کی مدت: حضرت مولانا عاشق الٰہی میرٹھی رحمۃ اللہ علیہ زود نویس ادیب تھے، صرف دو ماہ کی قلیل مدت میں ''تذکرۃ الرشید'' جیسی ضخیم سوانح آپ نے تحریر فرمائی، جس کے صفحات کی تعداد پانچ سو چھیانوے ہے، ہر صفحہ میں تیئس سطریں ہیں، کتابت درمیانے خط میں ہوئی ہے، اس سے موصوف کی زود نویسی کا اندازہ کرنا مشکل نہیں۔

اسلوب کی دلکشی: حضرت مولانا میرٹھیؒ کا اسلوب بڑا دلکش اور پُر لطف ہے، آپ کے قلم پر تشبیہ، مجاز، استعارہ، کنایہ اور دیگر صناعاتِ لفظیہ ومعنویہ گھنگور گھٹاؤں کی طرح اُمنڈتی تھی، سوانحی نگارشات میں اسلوب کی دلکشی مطلوب ہے، اسی سے قبولیتِ عامہ حاصل ہوتی ہے، مولانا میرٹھی اپنے ہم عصروں میں اسلوبِ نگارش میں بھی ممتاز ومنفرد ہیں۔ خود رقم طراز ہیں:

''خطبہ لکھنے کے بعد مضامین گویا سوکھے پتھر سے چشمۂ حیات کی طرح ابلتے اور فوّارے کی طرح جوش مار کر قلم سے نکلتے تھے، طبیعت تھی کہ بڑھتی چلی جاتی تھی اور ہمت تھی کہ زیادہ ہوتی جاتی

تھی، رات کوسوتا تو یہی خواب نظر آتا کہ سوانح لکھ رہا ہوں اور بہ ضرورت چلتا پھرتا تو یہی دھیان رہتا تھا کہ وقائع درج کتاب کررہا ہوں، اُمنگ تھی کہ اُچک اُچک کر آتی اور عبارات کی گھنگور گھٹائیں تھیں کہ اُمنڈ اُمنڈ کر دل پر چھائی جاتی تھیں۔

یہ تو غیبی اعانت تھی جس میں واسطہ کو دخل نہ ہونے کے باعث کسی بندۂ مقبولِ خدا کی کرامت سمجھنا چاہیے...الخ'' (تذکرۃ الرشید۱/۶-۷)

تدریس گنگوہی کی منظر نگاری: حضرت گنگوہیؒ اپنے گھر میں ہی طلبۂ کرام کو دینی کتابیں پڑھاتے تھے، اخیر میں تدریس صرف حدیث شریف کی کتابوں تک محدود ہوگئی تھی، سوانح نگار اس مضمون کی تمہید میں دو شعر لکھنے کے بعد لکھتے ہیں:

''جس نے ہرے بھرے باغ اور سرسبز وشاداب احمدی گلشن کے مہکنے والے پھولوں اور کھلنے والے ہنس مکھ غنچوں کی عطر بیز خوش بوؤں کو کبھی سونگھا ہوگا وہ خوب سمجھتا ہوگا کہ شریعتِ بیضا کے اصل الاصول مقدس و پاکیزہ فن حدیث کا درس کیا نعمت ہے؟ اور پھر درس بھی وہ جس کو منفعت عامہ کے اعتبار سے ابرنیساں کی دھواں دھار بارش اور تقاری (کذا) وروانی کی حیثیت سے دریائے موّاج وبحر تلاطم کی دلکش لہریں کہا جائے تو مناسب ہے، جس خوش نصیب طالب علم نے اُس بلبل چمنستان حدیث کی نواسنجیاں سنی ہیں اور جس میمون قسمت مہمان رسول کو اُس کشورستان والی مملکت تبحر کے خوانِ حدیث پر اقوال رسول کی لذیذ نعمتیں کھانی نصیب ہوئی ہیں، اُن کے دل سے پوچھیے کہ وہ کیف کیا تھا؟ جو قطب گنگوہیؒ کے دربار عامہ ودرس گاہ حدیث خیرالانام میں بیٹھ کر قلب کو حاصل ہوتا تھا اور وہ کیا مٹھاس وحلاوت تھی جس کو آج روتے ہو، چراغ لیے ڈھونڈتے پھرتے ہو سوائے یاس وناامیدی کچھ نہیں پاتے ہو۔'' (تذکرۃ الرشید۱/۸۸)

مولانا میرٹھی کی نگارشات میں اشعار کی ملاحت: حضرت مولانا عاشق الٰہی میرٹھی رحمۃ اللہ علیہ کی تحریر کا اسلوب بہت پسندیدہ ہے، ایک صدی کے بعد بھی اس میں بڑی خوبیاں نظر آتی ہیں، سلاست، روانی، برجستگی، محاورات وامثال کا استعمال، اشعار کی آمیزش غرض یہ کہ مولانا میرٹھی وقت کی زندہ زبان لکھنے کے عادی تھے، ادبیات سے گہرا لگاؤ تھا، ''تذکرۃ الرشید'' میں ایسے برمحل اشعار ہیں کہ باذوق ان کو پڑھ کر بہت محظوظ ہوتا ہے۔ اشعار کی آمیزش نے مولانا میرٹھی کے اسلوب کو ہردل عزیز بنادیا ہے، ان سے عبارت کی حسن آرائی میں کشش آگئی ہے۔ تفصیل کا موقع نہیں دوسری جلد کے صفحات کے نمبرات لکھے جارہے ہیں، ملاحظہ فرمائیے:

صفحہ باسٹھ پر پانچ اشعار، صفحہ چوراسی پر تین، صفحہ ایک سو گیارہ، صفحہ ایک سو اکیس اور ایک سو چوبیس پر پانچ پانچ اشعار، ایک سو اٹھائیس پر سات؛ ایک سو چونتیس پر آٹھ، ایک سو چھتیس پر نو، دوسو ایک پر چھ اور دوسو دو پر پانچ اشعار ہیں۔ یہ تو مثال کے لیے لکھے گئے ہیں، ورنہ ان کی تعداد اچھی خاصی ہے۔

حضرت گنگوہی کا سوانحی خاکہ: ولادت ونسب: ۶؍ذی قعدہ ۱۲۴۴ھ/۱۰؍مئی ۱۸۲۹ء دوشنبہ کو چاشت کے وقت ہوئی، آپ کا نسب چونتیس واسطوں سے حضرت ابوایوب انصاری رضی اللہ عنہ سے جاملتا ہے، آپ نجیب الطرفین تھے، یعنی شیخ زادہ انصاری اور ایوبی النسل تھے، گیارہویں پشت پر آپ کا نسب شیخ المشائخ حضرت شیخ عبدالقدوس گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ (۸۵۲ھ/۱۴۵۰ء =۹۴۵ھ/ ۱۵۳۰ء) سے جاملتا ہے (جو بہت بڑے عالم، مدرس، مصنف اور بزرگ تھے، ان کی سولہ تصانیف کا ذکر ملتا ہے، ان میں علمی، ادبی اور اسلامی کتابیں ہیں، خصوصاً تصوف کی کتابیں بہ نسبت زیادہ ہیں۔ ان کو چاروں سلاسل (چشتیہ، سہروردیہ، قادریہ، نقشبندیہ) میں اجازت حاصل تھی، سماع سے رغبت تھی)۔ (تفصیل کے لیے دیکھیے: مکتوبات قدوسیہ مترجم مولانا الحاج کپتان واحد بخش سیال چشتی صابری، الفیصل ناشران وتاجران کتب، لاہور، طبع ۲۰۱۰ء)

تعلیم: حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ نے ابتدائی تعلیم اپنے گھر میں حاصل کی، سات سال کی عمر میں ہی والد ماجد کا سایۂ عاطفت سر سے اُٹھ گیا، پھر آپ نے اپنے ماموں جناب مولانا محمد تقی سے فارسی کی کتابیں پڑھیں، ہدایۃ النحو مولوی محمد بخش سے پڑھی، پھر ''مدرسہ غازی الدین'' اجمیری گیٹ دہلی پہنچے، اس مدرسہ پر قبضہ کے بعد انگریزوں نے اس کا نام بدل کر ''عربک ہائی اسکول'' رکھ دیا جو آگے چل کر ''قدیم دلّی کالج'' کہا جانے لگا، تاریخ میں اسی نام سے مشہور ہے (استاذ محترم ڈاکٹر شمس الہدیٰ دریابادی زید مجدہ کے پی، ایچ ڈی کا مقالہ اسی کالج کے کارنامے پر ہے)۔ اب یہ ''ذاکر حسین کالج'' کے نام سے مشہور ہے۔

غرض یہ کہ اسی کالج میں استاذ الکل مولانا مملوک العلی رحمۃ اللہ علیہ تھے، آپ انھیں کی خدمت میں ۱۳۶۱ھ/۱۹۴۲ء میں پہنچے، آپ سے ایک سال پہلے حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ استاذِ محترم کی خدمت میں پہنچ چکے تھے، وہاں دونوں حضرات چار سال تک رہے اور ''استاذ الکل'' سے معقولات کی اکثر کتابیں پڑھیں (تذکرۃ الرشید، ص۴۰)۔ معقولات کی چند کتابیں آپ نے مولانا قلندر بخش سے بھی پڑھیں۔

انگریزوں کے قبضے کے بعد مدرسہ کالج بن چکا تھا، نصاب مکمل طور پر غیر اسلامی ہو چکا تھا، صرف ایک شعبہ میں اسلامیات کی چند کتابیں باقی تھیں، استاذ الکل اور اُن کے دونوں شاگردوں کو اس کا بڑا صدمہ تھا، اسی فکر نے انھیں دیوبند اور دوسرے علاقوں میں اسلامی مدارس کے فروغ پر مجبور کیا، بالآخر یہی مدارس حفاظتِ دین اور اشاعتِ اسلام کے مراکز ثابت ہوئے۔

استاذ الکل مولانا مملوک العلیؒ اپنے ان عزیز طلبۂ کرام کو اپنی قیام گاہ پر وہ کتابیں پڑھانے لگے جن کا پڑھنا عالمِ دین بننے کے لیے ضروری تھا، اسی دوران احیائے اسلام کی ذہن سازی بھی ہوتی رہی، معقولات کے علاوہ نصاب کی اکثر کتابیں حضرت مولانا رشیدالدین خاں سے پڑھیں۔

وہیں رہ کر ملک کے مایہ ناز ادیب وفقیہ حضرت مولانا مفتی صدرالدین آزردہؔ سے بھی استفادے کا موقع نصیب ہوا، حضرت آزردہ اپنے دونوں ہونہار شاگردوں کی غیر معمولی ذہانت وفطانت اور شوق ولگن سے بہت متاثر تھے۔

استاذ الکل مولانا مملوک العلیؒ نے اپنے دونوں محبوب شاگردوں کو حضرت مولانا شاہ عبدالغنی مجددیؒ کی خدمت میں جا کر حدیث شریف پڑھنے کا مشورہ دیا، موصوف اس وقت کے بہت بڑے محدث تھے، مجدد الف ثانی کے سلسلۂ نقشبندیہ کے بڑے بزرگ تھے، آٹھویں پشت پر آپ کا سلسلۂ نسب وتصوف شیخ احمد سرہندی (مجدد الف ثانی) سے جاملتا ہے (تذکرۃ الرشید۱/۲۹)؛ چنانچہ دونوں حضرات نے حضرت مجددی صاحب سے علمِ حدیث حاصل کیا، مشکوٰۃ المصابیح کے علاوہ اکثر کتابیں آپ نے ان سے پڑھیں، اس طرح دیوبند کا علمی اور حدیثی سلسلہ حضرت مجدد الف ثانیؒ سے جاملا، اس کی تفصیل "الیانع الجني في أسانید الشیخ عبدالغنی" میں ملتی ہے، یہ بھی واضح رہے کہ یہ دونوں بزرگان شاہ عبدالغنی مجددیؒ کے پاس جانے سے پہلے مشکوٰۃ المصابیح حضرت مولانا شاہ رفیع الدین صاحبؒ سے پڑھ چکے تھے، یعنی علم حدیث سے ایک طرح کی مناسبت پہلے حاصل ہو چکی تھی۔

مطالعہ میں انہماک: حضرت گنگوہیؒ مطالعہ میں بہت ہی زیادہ مستغرق رہتے تھے، کبھی ایسا بھی ہوجاتا کہ آپ کے پاس کھانا لاکر رکھ دیا جاتا اور آپ مطالعہ کے بعد کھانے کا ارادہ رکھتے؛ صبح تک ایسا انہماک اور استغراق رہتا کہ کھانا جوں کا توں رکھا رہ جاتا تھا۔ (تذکرۃ الرشید۱/۳۵)

ملامحمودؒ دیوبندی حضرت گنگوہی کے پہلے شاگرد: دارالعلوم دیوبند کی بنیاد ۱۵؍محرم الحرام ۱۲۸۳ھ مطابق ۳۱؍مئی ۱۸۶۶ء کو ''چھتہ مسجد'' میں رکھی گئی، استاذ ملامحمود اور طالب علم محمود حسن اور دوسرے طلبہ سے تعلیم کی ابتداء ہوئی، یہ ملامحمود کون ہیں؟ ان کے بارے میں مرتب طور پر سوانحی تفصیلات نہیں

ملتیں، منتشر طور پر کہیں کہیں کوئی بات لکھی ہوئی ملتی ہے۔ انھیں میں ''تذکرۃ الرشید'' کی یہ بات بھی ہے کہ حضرت گنگوہیؒ نے طالب علمی کے زمانے میں اپنی پڑھی ہوئی کتابوں کے پڑھانے کا ارادہ فرمایا اور مدارس میں یہ بات عام ہے کہ اونچی جماعت کا طالب علم اپنے سے نیچے کے طلبہ کو پڑھاتا ہے۔ حضرت گنگوہی نے جن لوگوں کو اس زمانے میں پڑھایا، ان قابلِ ذکر شخصیات میں ملامحمود دیوبندیؒ کا نام نامی بھی آتا ہے، ان کے ساتھ حضرت کے دو ماموں زاد بھائی ابوالنصر اور ابوالقاسم بھی اولین شاگردوں میں شامل ہیں۔ (تذکرۃ الرشید۱/ ۳۷)

نکاح کے بعد بلا استاذ حفظِ قرآن مجید: عام طور سے لوگ نکاح کے بعد تعلیم کو جاری نہیں رکھ پاتے؛ مگر حضرت گنگوہی کا امتیاز ہے کہ آپ نے نکاح کے بعد قرآن مجید حفظ فرمایا اور وہ بھی بلا کسی استاذ کے، اپنے گھر کے ایک حصے میں بیٹھے پورا دن قرآن پاک پڑھتے رہتے تھے، اگر نماز کے لیے مسجد جانا ہوتا یا کسی اور ضرورت سے اٹھتے تو قرآن مجید پر رومال ڈال کر چلے جاتے تھے اور واپس آکر پھر پڑھنے میں مصروف ہوجاتے؛ یہاں تک کہ چند دنوں (مدت معلوم نہیں) میں قرآن پورا کرلیا اور رمضان المبارک میں تراویح کی امامت بھی فرمائی۔ (تذکرۃ الرشید۱/ ۳۹-۴۰)

سلوک واحسان: سوانح نگار نے سلوک واحسان کو بھی نہایت ہی عمدہ اسلوب میں قلم بند کیا ہے، اس کی ابتداء دو شعر سے یوں فرمائی ہے:

بازارِ عشق وسُوقِ محبت کے جاں فروش ❊ لپکیں کہ چل چلاؤ ہے دنیائے دون کا
سیکھیں طریقِ وصل ولقائے خدائے پاک ❊ دل بیچ کر خرید لیں سودا جنون کا

(تذکرۃ الرشید۱/ ۴۰)

مذکورہ بالا شعر میں سلوک واحسان کی پوری حقیقت بیان فرمادی ہے، جس کو قرونِ وسطیٰ میں تصوف کا نام دیا گیا تھا، اسی نام سے شہرت ہوئی؛ مگر اس میں پوری حقیقت کی ترجمانی نہیں ہے؛ اس لیے اس کے لیے بہترین تعبیر ''سلوک اور احسان'' ہے، یعنی خدائے پاک سے قریب کرنے والے راستے پر چلنا اور عمل میں حُسن پیدا کرنا، شعر میں اس کو ''طریقِ وصل اور لقائے خدائے پاک'' سے تعبیر کیا گیا ہے اور دل بیچ کر عشقِ خداوندی خریدنے کا بہترین استعارہ کیا گیا ہے، راہِ سلوک کے رہروان کو ''بازارِ عشق کا جانفروش'' کہا گیا ہے اور ساتھ ہی دنیا کی بے ثباتی کی دلیل دے کر سلوک واحسان کو اختیار کرنے کا ان سے التماس کیا گیا ہے۔

غرض یہ کہ حضرت گنگوہیؒ اور حضرت نانوتویؒ، حضرت حاجی امداداللہ صاحب مہاجر مکیؒ سے

بیعت تھے، طالب علمی کے زمانے میں ہی تعارف ہو چکا تھا، حضرت حاجی صاحب کو ان دونوں حضرات کا پوشیدہ جوہر نظر آ گیا تھا۔

حضرت حاجی صاحب کا خواب: حضرت حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ سلوک واحسان میں بڑی عظیم شخصیت کے حامل ہیں، تقریباً سات آٹھ سو علمائے کرام آپ سے مرید ہیں (تذکرۃ الرشید، ص ۴۷) علماء میں سب سے پہلے حضرت گنگوہیؒ آپ سے بیعت ہوئے، اس کی بشارت خواب کے ذریعہ حضرت حاجی صاحب کو ہو چکی تھی، آپ کی بھاوج صاحبہ بڑی نیک تھیں، سارے مہمانوں کا کھانا خود پکاتی تھیں، ایک بار حضرت حاجی صاحب نے خواب میں دیکھا کہ آپ کی بھاوج صاحبہ کھانا پکا رہی ہیں کہ جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائے اور آپ کی بھاوج سے فرمایا:

''تو اس قابل نہیں کہ امداد اللہ کے مہمانوں کا کھانا پکائے، اس کے مہمان علماء ہیں، اس کے مہمانوں کا کھانا میں پکاؤں گا۔''

سوانح نگار لکھتے ہیں:

''اس مبارک خواب کی تعبیر حضرت امام ربانی (مولانا رشید احمد) محدث گنگوہیؒ سے شروع ہوئی؛ اس لیے کہ علماء میں آپ ہی پہلے عالم ہیں جو اعلیٰ حضرت حاجی صاحب کے ہاتھ پر بیعت ہوئے، آپ کے بعد چار دانگ عالم سے جوق جوق علماء کی آمد شروع ہوئی...الخ'' (تذکرۃ الرشید ۱/۴۶)

حضرت گنگوہیؒ نے حضرت حاجی صاحب کے ساتھ ذکر کیا تو حاجی صاحب نے فرمایا کہ آپ تو بڑے پُرانے مشاق معلوم ہوتے ہیں، غرض یہ کہ حضرت گنگوہیؒ حضرت حاجی صاحب سے بیعت ہوئے، سلوک واحسان کے مراحل طے کر کے درجۂ کمال حاصل کیا؛ ساتھ ہی آپ نے تصوف میں تجدیدی کارہائے نمایاں بھی انجام دیے، ''طریقت اور شریعت'' کے فرق کو ختم فرمایا اور یہ واضح فرمایا کہ سلوک واحسان کا کوئی عمل شریعت کے خلاف نہیں ہوسکتا، اگر ہے تو اس کو چھوڑنا ضروری ہے، قرونِ وسطیٰ میں جو چیزیں تصوف میں در آئی تھیں، سب کو یک لخت حضرت گنگوہیؒ نے رد فرمادیا، آپ کے نزدیک تصوف میں بس انھیں چیزوں کی گنجائش ہے جن کے شواہد، نظائر اور دلائل خیر القرون میں موجود ہیں، آپ کو سنت وشریعت کے خلاف کوئی چیز برداشت نہیں تھی؛ چنانچہ ایک بار حضرت حاجی صاحب نے حضرت تھانویؒ کے ذریعے بعض مسائل تحریر فرما کر ارسال فرمائے تو آپ نے خفگی کا اظہار فرمایا اور صاف صاف ارشاد فرمایا کہ حضرت حاجی صاحب سے طریقت میں بعیت کیا ہے، شریعت کے مزاج ومذاق اور اصول وضوابط کے خلاف جو چیز بھی ہوگی، اس کو میں ہرگز نہیں مان سکتا۔

غرض یہ کہ سنت و بدعت اور شریعت وطریقت کے سلسلے میں حضرت گنگوہیؒ کا کارنامہ بہت ممتاز ہے اور واضح تعبیر میں یہ کہا جاسکتا ہے کہ ''دیوبندی مکتبۂ فکر'' کی تشکیل میں حضرت گنگوہیؒ کا کارنامہ سب سے نمایاں اور آبِ زر سے لکھنے کے قابل ہے، آپ سے پہلے بہت سی چیزیں دین وشریعت سمجھ کر انجام دی جاتی تھیں، ''طریقت'' کے نام پر بہت سے غیر مستند اعمال بلاتکلف کیے جاتے اور درست مانے جاتے تھے، آپ نے سنت و بدعت کے درمیان فرق سمجھایا، بہت سی فقہی کتابوں میں مندرج بدعات سے مکمل طور پر براءت کا اظہار فرمایا، آپ ہی کی بہ دولت ''دیوبندیت'' منقح ہوکر سامنے آئی، اگر آپ خطِ اعتدال نہ کھینچتے تو دیوبند کو دنیا بھر کے مسلمانوں میں محبوبیت کا مقام حاصل نہ ہوتا، حضرت شیخ احمد سرہندی مجدد الف ثانیؒ کے بعد آپ کا کارنامہ سب سے نمایاں ہے، آج بھی دارالعلوم دیوبند اسی اعتدال کا ترجمان ہے؛ اسی لیے ہر غیر معتدل فرقہ دیوبند سے بغض وعناد رکھتا ہے۔

تحریک آزادی میں حصہ: ہندوستان میں مغلیہ سلطنت (۱۵۲۶ء-۱۹۵۷ء) کا زوال ہو چکا تھا، تین صدی سے زیادہ حکومت کرنے والے خاندان کا زمام اقتدار ختم ہوگیا تھا، ہزاروں مدارس ومکاتب بند کردیے گئے، خود صاحبِ سوانح کا ''مدرسہ غازی الدین'' اجمیری گیٹ انگریزی اسکول میں بدل چکا تھا، اسلامی کتابوں کو نصاب سے نکال کر اپنی مرضی کی کتابیں انگریزوں نے داخل کردی تھیں، حضرت گنگوہیؒ اور نانوتویؒ کو طالب علمی کے زمانے سے ہی غاصب حکومت سے نفرت تھی؛ چنانچہ ۱۸۷۹ء میں حضرت گنگوہی اور ان کے رفقاء پر بغاوت کا الزام عائد ہوا۔ (تذکرۃ الرشید۱/۷۳)

سوانح نگار نے اس مضمون کو بھی نہایت ہی شرح وبسط کے ساتھ (ص۷۳-۸۸) لکھا ہے، حضرت کی گرفتاری حکیم ضیاء الدین صاحب کے مکان سے رام پور (سہارنپور) سے ہوئی (تذکرۃ الرشید ص۸۰) پھانسی کا خدشہ تھا؛ مگر اللہ رب العالمین نے رہائی عطا فرمائی۔ (ایضاً۱/۸۵)

گرفتاری کے چھ ماہ بعد رہائی: حضرت مولانا سید محمد میاں صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی شہرہ آفاق تصنیف ''علمائے ہند کا شان دار ماضی'' کے حاشیے میں لکھا ہے:

''صرف امام ربانی حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ گرفتار ضرور کیے گئے، چھ مہینے حوالات میں بھی رہے؛ مگر سزا اُن کو بھی نہیں ہوئی، مقدمہ میں صاف بری ہوگئے۔'' (حاشیہ: علمائے ہند کا شان دار ماضی ۴/۲۸۴، کتابستان، قاسم جان، دہلی سنہ اشاعت ۱۹۸۵ء)

سوانح نگار کے نزدیک شاملی کی جنگ باضابطہ نہ تھی، وہ اتفاقی منڈبھیڑ تھی: ۱۲۷۶ھ-۱۸۷۹ء میں حضرت گنگوہیؒ اور ان کے رفقائے کار پر انگریزی حکومت کے خلاف بغاوت کا الزام عائد ہوا۔

ان دنوں پورے ہندوستان خصوصاً دہلی اور اطراف دہلی کے احوال بہت ہی خراب تھے؛ بلکہ بائیس سال پہلے ۱۸۵۷ء سے ہی حالات خراب چل رہے تھے، لاکھوں بے گناہوں کو پھانسی دی جا چکی تھی، ان میں علمائے کرام کی تعداد زیادہ تھی، تھانہ بھون کو چاروں طرف سے گھیر کر گولہ باری کی گئی، اندر گھس کر لوٹ مار اور خون خرابہ اتنا کیا گیا کہ اس کا بیان کرنا مشکل ہے۔ غرض یہ کہ حاکم کی سرپرستی ختم ہوگئی تھی، مغلیہ حکومت کی طرف سے یہ اعلان کردیا گیا تھا کہ ''ہر شخص کو اپنی حفاظت خود کرنی چاہیے''؛ اس لیے لوگ حضرت حاجی امداد اللہ صاحبؒ کے پاس جمع ہوئے اور عرض کیا کہ آپ ہمارے دینی پیشوا ہیں؛ اس لیے دینی پیشوائی بھی فرمائیں اور امیر المومنین بن کر ہمارے قضیے چکا دیا کریں؛ چنانچہ حاجی صاحب نزاعی معاملات کو حل کرنے لگے اور علمی تعاون کے لیے اپنے خدام کو اپنے پاس رکھ لیا، اس کو مخبروں نے ''متوازی حکومت'' کا عنوان دے کر انگریزوں کو غلط فہمی میں ڈال دیا؛ بالآخر حضرت حاجی صاحب کو ہجرت پر مجبور ہونا پڑا۔

سراسیمگی کے عالم میں لوگ گھروں میں بند کانپتے رہتے تھے؛ لیکن حضرت نانوتوی، گنگوہیؒ اور ان کے رفقاء اطمیان سے باہر نکلتے تھے اور احتیاط کے طور پر اپنے ساتھ تلوار رکھتے تھے، شاملی، کیرانہ اور مظفرنگر جاتے تو چند ساتھی ساتھ رہتے، دوسری طرف انگریزی فوج بندوقوں کے ساتھ غول کی غول گشت کرتی پھرتی تھی، اتفاق سے اُن کا سامنا ہوگیا، اس کی منظر نگاری سوانح نگار نے ان الفاظ میں کی ہے:

''....ایک مرتبہ ایسا بھی اتفاق ہوا کہ حضرت امام ربانی (مولانا رشید احمد گنگوہیؒ) اپنے رفیق جانی مولانا قاسم العلوم اور طبیب روحانی اعلیٰ حضرت حاجی (امداد اللہ) صاحب و نیز حافظ ضامن صاحب ہمراہ تھے کہ بندوقچیوں سے مقابلہ ہوگیا، یہ نبرد آزما دلیر جتھا اپنی (مغلیہ) سرکار کے مخالف باغیوں کے سامنے سے بھاگنے یا ہٹ جانے والا نہ تھا؛ اس لیے اٹل پہاڑ کی طرح پیر جما کر ڈٹ گیا اور سرکار پر جاں نثاری کے لیے تیار ہوگیا، اللہ رے شجاعت و جواں مردی کہ جس ہولناک منظر سے شیر کا پتہ پانی اور بہادر سے بہادر کا زُہرہ آب ہوجائے وہاں چند فقیر ہاتھوں میں تلواریں لیے جم غفیر بندوقچیوں کے سامنے ایسے جمے رہے گویا زمین نے پاؤں پکڑ لیے ہیں؛ چناں چہ آپ پر فیریں ہوئیں اور حضرت حافظ ضامن صاحب رحمۃ اللہ علیہ زیر ناف گولی کھا کر شہید بھی ہوئے۔

حضرت مولانا قاسم العلوم ایک مرتبہ یکا یک سر پکڑ کر بیٹھ گئے، جس نے دیکھا جانا کہ کنپٹی میں گولی لگی اور دماغ پار کر کے نکل گئی، اعلیٰ حضرت (حاجی امداد اللہ صاحب) نے لپک کر زخم پر ہاتھ رکھا

اورفرمایا: کیا ہوا میاں؟ عمامہ اُتار کر سر کو جو دیکھا، کہیں گولی کا نشان تک نہ ملا اور تعجب یہ ہے کہ خون سے تمام کپڑے تر تھے۔'' (تذکرۃ الرشید۱/۷۴-۷۵)

الزامات: ان نہتھے بزرگوں پر مخبروں نے بڑے بڑے الزامات عائد کیے کہ یہی فساد کی جڑ ہیں، شاملی کی تحصیل پر انھوں نے ہی حملہ کیا تھا اور آگ لگا کر سرکاری خزانہ لوٹا تھا، سوانح نگار لکھتے ہیں:

...''حالاں کہ یہ کمبل پوش، فاقہ کش، نفس کُش حضرات فسادوں سے کوسوں دور تھے۔'' (تذکرۃ الرشید۱/۷۶)

تذکرۃ الرشید پڑھنے والے سادہ لوح قاری کا تاثر: اگر کوئی سادہ لوح قاری مولانا عاشق الٰہی میرٹھی رحمۃ اللہ علیہ کی تحریر پڑھے تو اس کو صاف سمجھ میں آئے گا کہ شاملی کی جنگ باضابطہ نہ تھی وہ اتفاقی منڈ بھیڑ تھی، اس وقت کے بزرگانِ دین کے سلسلے میں الزامات بھی بے بنیاد تھے، انھوں نے انگریزی حکومت کے خلاف کوئی تحریک نہ چھیڑی تھی اور نہ ہی اس طرف ان کا ذہن گیا تھا۔

اصل حقیقت: جب کہ صحیح بات یہ ہے کہ شاملی کی جنگ باضابطہ تھی، اس کے دلائل اور شواہد تاریخ کے اوراق میں محفوظ ہیں، حضرت مولانا محمد میاں صاحب نے ان سب کو اپنی مایہ ناز تصنیف: ''علمائے ہند کا شاندار ماضی'' میں واضح فرمایا ہے اور ساتھ ہی حضرت مولانا عاشق الٰہی میرٹھی رحمۃ اللہ علیہ کی مجبوری اور براءت بھی لکھ دی ہے کہ آپ نے حضرت گنگوہیؒ کے اتنے بڑے کارنامے کو تاویلات کا جامہ کیوں پہنایا؟ دراصل وہ وقت کا تقاضا تھا، انگریزوں کی حکومت تھی، شر اور فتنوں سے بچنے کے لیے انھوں نے یہ اسلوب اختیار کیا، مولانا سیّد محمد میاں صاحب لکھتے ہیں:

''چوں کہ ''تذکرۃ الرشید'' کی تصنیف وترتیب کا وہ وقت تھا جب برطانوی سامراج کا نقطۂ عروج خطِ استواء پر پہنچا ہوا تھا اور نہ صرف زبان اور قلم بلکہ لوگوں کے ضمیر بھی اس کی عظمت وہیبت سے متاثر تھے تو آپ کو بھی تحریر میں وقت کے تقاضے کی تعمیل کرنی پڑی، انتہا یہ کہ بعض چیزوں کے اعتراف واقرار کے لیے بھی انکار کا پیرایہ اختیار کرنا پڑا ہے۔'' (علمائے ہند کا شاندار ماضی۴/۲۵۳)

آگے لکھتے ہیں:

''مولانا عاشق الٰہی صاحب کی تاویل کی حقیقت کچھ بھی ہو؛ مگر اس سے یہ ضرور ثابت ہو گیا کہ

۱- تھانہ بھون ایک مرکز بنایا گیا۔ (پہلی بار انگریزوں کو شکست ہوئی تو دوسری بار پورے قصبہ کو تباہ وبرباد کر دیا؛ اس لیے وہ گویا جدوجہد کا مرکز بن گیا۔ اشتیاق)

۲- سیدنا حضرت حاجی امداد اللہ صاحبؒ امیر مقرر ہوئے۔

۳-اُن کے ہاتھ پر بیعت کی گئی۔

۴-ایک نظام حکومت قائم کیا گیا، جس میں فصل خصومات یعنی عدالت جیسے محکمے حضرت مولانا رشید احمد صاحب اور حضرت مولانا محمد قاسم صاحب کے سپرد کیے گئے۔ (علمائے ہند کا شاندار ماضی ۲۵۴/۴)

مذکورہ بالا اقتباس میں مولانا سیّد محمد میاں صاحب نے یہ بتانے کی کوشش کی ہے کہ مولانا میرٹھیؒ نے وقت کے تقاضے کی وجہ سے صاف صاف جہاد کی بات نہیں لکھی ہے؛ لیکن اگر ان کی تحریر میں غور کیا جائے تو درج بالا چار باتیں سامنے آتی ہیں اور وہی مستقل تحریک کی بنیاد ہیں۔

پھر آپ نے تقریباً پچاس صفحات لکھے ہیں، جن میں تحریک کی ابتداء سے انتہا تک کی تفصیلات لکھی ہیں۔

تحریک آزادی کی ابتداء: حضرت مولانا محمد میاں دیوبندیؒ کی بیان کردہ تفصیلات کا خلاصہ یہ ہے کہ ۱۸۵۷ء کے بعد دہلی میں حضرت مولانا مملوک العلی کی زیرصدارت ایک بورڈ بنایا گیا جس کے محرک اوّل اور بانی شاہ حسن عسکری تھے، جو بادشاہ کے پیر تھے رام پور منیہاران، ضلع سہارنپور کے رہنے والے تھے۔ (علمائے ہند کا شاندار ماضی ۲۶۷/۴) جس کے خصوصی ارکان حضرت مولانا قطب الدین دہلوی، حضرت مولانا مظفر حسین کاندھلوی اور حضرت مولانا عبدالغنی دہلوی تھے (علمائے ہند کا شاندار ماضی ۲۶۰/۴، ۲۶۳) ان کے ساتھ حضرت حاجی امداد اللہ، حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی، حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی، مولانا فیض الحسن سہارنپوری، حضرت مولانا رحمت اللہ کیرانوی، حضرت مولانا مظہر نانوتوی، حضرت مولانا منیر نانوتوی اور حضرت مولانا محمد یعقوب نانوتوی رحمہم اللہ بھی تھے۔

پھر جب نظام حکومت کی تشکیل ہوئی تو حضرت حاجی صاحب کو امیر، حضرت نانوتوی اور حضرت گنگوہی کے ساتھ مولانا منیر اور حافظ ضامن شہید کو فوج، حفاظت، فصل خصومات اور عدل وقانون وغیرہ کے شعبے سپرد کیے گئے۔ (علمائے ہند کا شاندار ماضی ۲۶۶/۴)

بادشاہ کو شمولیت کا مشورہ: اس موقع پر یہ بھی ضروری سمجھا گیا کہ خود بادشاہ کو بھی ضبط ونظم قائم کرنے اور اس جیسے نظام میں داخل ہونے کا مشورہ دیا جائے؛ چنانچہ نواب شبیر علی مرادآبادی جو بادشاہ کے منہ چڑھے اور بے تکلف مصاحب تھے، اسی مقصد کے لیے دہلی بھیجا گیا۔ (ایضاً ۲۶۷/۴)

منظم جہاد: ۲/جولائی ۱۸۵۷ء کو جنرل بخت خاں (۱۷۹۳ء-۱۸۵۹ء) پہلے انگریزی

فوج کے پیارہ دستے میں کمانڈر تھے، ۱۸۵۶ء میں حکومت نے ان کو معزول کر دیا تو انھوں نے شاہ ظفر کو انگریزوں کے خلاف فوجی طاقت کو منظّم کرنے کا مشورہ دیا، جب مشورہ قبول نہیں کیا گیا تو خود انھوں نے فوج منظّم کیا اور باضابطہ فوج لے کر دہلی پہنچ گئے، اور وہاں جامع مسجد دہلی میں علمائے کرام کا اجتماع کیا اور ایک فتویٰ مرتب ہوا، جس پر ''رحمت اللہ'' نام بھی تھا غالباً یہ مولانا رحمت اللہ کیرانویؒ تھے۔

اس وقت کے حالات کے لحاظ سے دہلی میں ایک صالح نظام قائم ہوگیا، علمائے کرام اور رہنمایانِ ملت نے غور وخوض کے بعد جہاد کا فتویٰ صادر کر دیا، تو اب تھانہ بھون والی جماعت کے لیے بھی راستہ صاف ہوگیا؛ چنانچہ مسئلہ اقدام (جہاد) کے عنوان سے ایک جلسہ ہوا، اس میں سارے حاضرارکان نے اقدام کا فیصلہ کیا، یعنی یہ دہلی کے فتویٰ جہاد کی تصدیق وتوثیق تھی۔ اس اجتماع میں صرف ایک بزرگ حضرت حاجی صاحب کے پیر بھائی مولانا شیخ محمد تھانوی کی رائے مخالف رہی، انھوں نے حضرت نانوتویؒ کے استفسار پر دو عذر بتائے ''ایک اسلحہ کی کمی دوسرے نصبِ امام کی شرط'' مفقود ہے تو حضرت نانوتویؒ نے غزوۂ بدر کی بے سروسامانی کی مثال دی اور حاجی صاحب کو امیرالمومنین بتایا؛ لیکن وہ خاموش رہے، حافظ ضامن شہیدؒ نے فرمایا: ''مولانا بس سمجھ میں آ گیا۔'' (علمائے ہند کا شاندار ماضی ۴/۲۷۴)

چنانچہ: ''سرفروشانِ دین ووطن سر ہتھیلی پر لے کر ایک منظّم طاقت سے ٹکرانے کے لیے گھروں سے نکل کھڑے ہوئے اور تھانہ بھون سے شاملی کی طرف مارچ شروع کر دیا، جس کا نصب العین دہلی تھا۔'' (سوانح قاسمی ۲/۱۲۹، مکتبہ دارالعلوم دیوبند)

جہاد کا اعلان کر دیا گیا لوگ جوق در جوق ہزاروں کی تعداد میں اکٹھا ہونے لگے، حضرت حاجی صاحب ''امیر''، حضرت نانوتوی ''سپہ سالار''، حضرت گنگوہی قاضی، مولانا منیر اور حافظ ضامن صاحب میمنہ اور میسرہ کے افسر مقرر ہوئے تھے، حکومت کی طرف سے پہلے سے لوگوں کو ہتھیار رکھنے کی اجازت تھی، مسلمان چلانا بھی سیکھتے تھے؛ البتہ پرانی قسم کے ہتھیار تھے۔

خبر آئی کہ انگریزوں نے توپ خانہ سہارنپور سے شاملی کو بھیجا ہے، توپ کا مقابلہ مشکل نظر آ رہا تھا، حضرت گنگوہیؒ کو تیس چالیس آدمی کے ساتھ حضرت حاجی صاحب نے امیر بنا کر بھیجا وہ باغ میں چھپ گئے، وہاں سے توپ لے کر فوج گذرنے والی تھی، سب نے ایک آواز پر فائر کیا، فوج خوف وہراس کے مارے بھاگ گئی، توپ خانہ کو حضرت گنگوہی نے مسجد کے سامنے لا کھڑا کیا، بعد میں اس

توپ کوایک بلند مقام پر نصب کر دیا گیا، حضرت حافظ ضامن شہید اسی میں شہید ہوئے۔ (علمائے ہند کا شاندار ماضی ۴/۲۷۶-۲۷۹)

یہاں یہ ذکر کرنا بھی بے جا نہ ہوگا کہ شاملی میں ایک ہندو زمین دار نے بھی ہنگامہ برپا کر رکھا تھا، انگریز کو اس نے ناک سے چنے چبوا رکھے تھے، شاملی کی تحصیل کا ذمہ دار ایک مسلمان ابراہیم خاں تھا، جب تحصیل پر حملہ ہوا تو اس کے خاندان کے کافی لوگ اس میں ہلاک ہوئے، اس کے بہت سے لوگ قید بھی ہوئے۔ (حاشیہ علمائے ہند کا شاندار ماضی ۴/۲۷۵)

مقالہ نگار کا تبصرہ: ان ساری تفصیلات کو سامنے رکھ کر دیکھا جائے تو صاف سمجھ میں آتا ہے کہ ''تذکرۃ الرشید'' کے مصنف نے کسی مصلحت کی وجہ سے ان دوٹوک حقائق کو بیان نہیں کیا ہے، شیخ الاسلام حضرت مولانا حسین احمد مدنی رحمۃ اللہ علیہ کی تحریر ملاحظہ فرمائیے:

''ہمارے اکابر حضرت شاہ ولی اللہ، شاہ عبدالعزیز اور اُن کے تلامیذ کے شاگرد اور خوشہ چیں رہے ہیں، یہ نہیں ہوسکتا تھا کہ حضرت شاہ صاحب اور ان کے خاندان کے مسلک اور حکم کے خلاف چلیں...الخ۔'' (نقش حیات ۲/۴۱)

یہ اکابر حضرت شاہ عبدالعزیز کے فتویٰ کے خلاف کیسے کر سکتے تھے، مولانا میرٹھی کی تحریر بالکل سرد اور ٹھنڈی ہے؛ جب کہ حضرت شیخ الاسلام مولانا حسین احمد مدنی، مولانا عبیداللہ سندھی اور مولانا منصور انصاری اور ان کے رفقاء کی تحریر گرم اور پر جوش ہے، دونوں میں مطابقت پیدا کرنے کے لیے مولانا محمد میاں دیوبندی والی تاویل کرنا ضروری ہے، مولانا نے حاشیہ میں ایک جملہ لکھا ہے جو چونکا دینے والا ہے اور وہی اصل وجہ ہے فرماتے ہیں:

...''اس زمانے کے حالات کا بھی کچھ ایسا ہی تقاضا تھا اور خود مولانا عاشق الٰہی صاحب کا فطری ذوق اپنے زمانہ میں انگریزوں کا حامی واقع ہوا تھا۔'' (حاشیہ علمائے ہند کا شاندار ماضی ۴/۲۷۰)

حاشیہ میں ایک جگہ لکھتے ہیں:

''اس بارے میں ان بزرگوں کی رائے اور تحقیق معتبر ہوگی جنھوں نے اس زمانہ کی تاریخ پر محققانہ نظر ڈالی، تحریکات اور ان کے اسباب کو سمجھا اور ان کے تقاضوں کو پورا کرنے میں پوری پوری زندگیاں صرف کر دیں، مثلاً مفکر مشرق مولانا عبیداللہ سندھیؒ، مولانا محمد میاں صاحب عرف مولانا منصور انصاریؒ، شیخ الاسلام حضرت مولانا حسین احمد صاحب مدنیؒ الخ۔'' (ایضاً ۴/۲۷۱)

مقالہ نگار ان اکابر کی تحریروں کا مطالعہ کر کے اس نتیجہ پر پہنچا ہے کہ علمائے دیوبند میں دو طرح

کی ذہنیت رہی ہے، کچھ لوگ تو انگریزوں کے سخت ترین مخالف رہے، باضابطہ تحریک چلائی، جہاد کیا، قید و بند کی صعوبتیں جھیلیں اور اللہ کے راستے میں شہید ہوئے اس قسم میں حضرت نانوتوی، گنگوہی، شیخ الہند، شیخ الاسلام، علامہ سندھی، مولانا منصور انصاری اور ان کے جملہ رفقاء اور بعد کے وہ اکابر جو دارالعلوم دیوبند سے قریب رہے۔ آج بھی دارالعلوم دیوبند کے فضلاء میں وہ رنگ نظر آتا ہے۔

جب کہ دوسری طرف کچھ اکابر وقت کی مصلحت کے پیش نظر، حالات کی مشکلوں کو دیکھ کر، انگریزی حکومت کی طمطراقی کو بھانپ کر خاموشی اختیار فرمائی۔ انھوں نے شروع سے ہی کنارہ کشی اختیار فرمائی اور علم دین کی خدمت میں لگے رہے، اس قسم میں سب سے پہلے حضرت مولانا شیخ محمد محدث تھانوی ہیں پھر حضرت مولانا خلیل احمد سہارنپوری، حضرت مولانا عاشق الٰہی میرٹھی اور ان کے ہم مزاج رفقاء ہیں اور وہ حضرات بھی جنھوں نے بعد تک اپنے کو سیاست سے مکمل طور پر دور رکھا ان میں سے اکثر مظاہر علوم سہارنپور سے قریب رہے؛ چنانچہ آج بھی وہاں کے فضلاء میں یہ خصوصیات نظر آتی ہیں۔ کافی عرصہ گزر جانے کے بعد اب دونوں اداروں میں دونوں طرح کے نظریے کے حاملین ملتے ہیں، دونوں میں بعض سیاست میں دلچسپی لیتے ہیں اور بعض ہر طرف سے کٹ کر صرف علم دین کی محنت اور ظاہر و باطن کی پاکیزگی کی فکر میں لگے رہتے ہیں، دونوں میں خیر ہے، دونوں سے اسلام کی آبیاری ہو رہی ہے، قوم وملت مستفیض ہو رہی ہے، سکّے کا دونوں رخ چمکدار اور ہیرے کا ہر پہلو رونق افروز ہے۔

طب کا مطالعہ اور علاج: حضرت گنگوہیؒ کے ماموں مولوی محمد تقی طبیب تھے (تذکرۃ الرشید ۱/۶۳) گھر کے ماحول میں طبی نسخے اور طب سے متعلق معلومات کا ہونا ایک فطری امر ہے؛ چنانچہ حضرت نے طب کا باضابطہ مطالعہ کیا، اس کی صورت یہ لکھی ہے کہ ایک بار حضرت کی والدہ کی خالہ صاحبہ کی طبیعت ناساز ہوئی، اسفل معدہ میں درد تھا، کافی دوائیں چلیں؛ مگر شفا نہ ہوئی، ایک بار انھوں نے آپ سے نہایت ہی الحاح کے ساتھ عرض کیا:

''مجھے محمد تقی کی دوا سے فائدہ نہیں ہوتا، بیٹے تو بھی تو بڑا عالم فاضل ہے، تو ہی کچھ کر اور کوئی دوا ایسی بتا کہ جس سے میری تکلیف رفع ہو۔''

حضرت گنگوہیؒ نے نانی کی تکلیف کو محسوس کیا اور محمد اکبر ارزانی (متوفی ۱۷۷۲ء) کی کتاب ''میزان الطب'' کا مطالعہ شروع فرمایا اور ''ورم معدہ'' کی تشخیص فرمائی، ماموں جان ''بند ہیضہ'' بتا رہے تھے؛ جب ورم کا علاج ہوا تو نانی کی طبیعت ٹھیک ہوگئی، اب ماموں جان نے طب کے باضابطہ مطالعہ

کا مشورہ دیا، چناں چہ آپ نے مسیح دوراں حکیم محمد اعظم خان کی کتاب ''اکسیر اعظم'' کا مطالعہ فرمایا اور طبابت شروع فرمادی، چند ہی دنوں میں لوگوں کا رجوع ہوا، پھر اور ترقی ہوئی اطراف واکناف کے اطبار بھی مشکل امراض میں آپ سے رجوع کرنے لگے۔ (تذکرۃ الرشید۱/۶۳-۶۵)

آپ کے بہت سے طبی واقعات، معالجات کی نوعیتیں اور طبی نسخے سوانح نگار نے جمع کیے ہیں، ان کی تفصیل سوانح میں (۶۶، ۷۲) دیکھی جاسکتی ہے۔ سب سے متاثر کن چیز یہ ہے کہ آپ مریضوں سے علاج کا معاوضہ نہیں لیا کرتے تھے، محض خدمتِ خلق کی نیت سے یہ پیشہ بھی اختیار کیے ہوئے تھے، پہلے طب اسی نیت سے سیکھتے تھے، آج معاملہ الٹا ہے۔

غرض یہ کہ ''تذکرۃ الرشید'' سوانح مواد اور اسلوب دونوں اعتبار سے ممتاز حیثیت کی حامل ہے۔

حضرت گنگوہیؒ کے اوصافِ حمیدہ: حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ کو اللہ رب العالمین نے بہت سی خصوصیات سے نوازا تھا جو کسی ایک شخص میں بہت کم ہی پائی جاتی ہیں، آپ کے اندر علم وعمل کے ساتھ قوتِ حافظہ، قوتِ اجتہاد واستنباط، اتقان وعدالت، ثقاہت ودیانت، تدبر وتبحر، لطف وشفقت وغیر صفات بہ درجۂ اتم موجود تھیں، ان سب کے ساتھ آپ کا اندازِ درس لاجواب تھا، دورۂ حدیث شریف کی ساری کتابیں (صحیح بخاری، صحیح مسلم، جامع ترمذی، سنن ابوداؤد، سنن نسائی، سنن ابن ماجہ، شرح معانی الآثار (طحاوی) موطا امام مالک، موطا امام محمد) تنِ تنہا پڑھاتے تھے دنیا کے مختلف خطوں سے جوق در جوق طلبۂ کرام دربار دُربار میں حاضر ہوئے تھے؛ لیکن لطف کی بات یہ ہے کہ آپ کسی سے کچھ پیسے نہیں لیتے؛ بلکہ کھانے اور رہنے کا انتظام بھی مقدور بھر خود ہی کرتے تھے۔

دورۂ حدیث شریف کے علاوہ تفسیر، فقہ، اصول فقہ اور اصولِ حدیث کا بھی سلسلہ جاری تھا اور فتاویٰ کا سلسلہ تو بینائی جانے کے بعد بھی جاری رہا۔ (تذکرۃ الرشید۱/۹۳)

حضرت گنگوہیؒ کا اندازِ درس: احادیث کے درس کا انداز یہ تھا کہ دورۂ حدیث شریف کی ساری کتابوں سے پہلے ترمذی شریف بڑے ہی شرح وبسط کے ساتھ پڑھاتے تھے، طلبہ کی استعداد کے مطابق کلام کرتے، پہلے ترجمہ نہایت عام فہم الفاظ میں بیان فرماتے اور اگر کسی آیت یا حدیث سے تعارض نظر آتا تو اسے دُور فرماتے، اسمار الرجال کی بحث کرتے رواۃ پر جرح وتعدیل فرماتے، کبھی مضمون کی وضاحت کے لیے سیاق وسباق بیان کرتے، مضامین کا ربط بیان فرماتے، اصولِ حدیث اور اصول کے نکات واشارات بیان فرماتے، مشکل مقامات پر طلبہ کو متوجہ فرما کر مضمون کو مکرر، سہ کرر بیان فرماتے، اشکالات کو بڑی لطافت سے حل کرتے، حدیث سے مسائل کا استنباط فرماتے، طلبہ کے

سوال واشکال پر غصہ نہ ہوتے، پڑھاتے وقت طلبہ کے ساتھ بہت ہی زیادہ بے تکلف اور ظریف الطبع بن جاتے؛ تاکہ ہر طالب علم اپنا شبہ ظاہر کر سکے۔ (تذکرۃ الرشید، ص ۹۸-۹۰)

پٹھان کا لطیفہ: سوانح نگار نے ایک لطیفہ لکھا ہے کہ کتاب میں ایک لفظ ''عطّارہ'' آیا، پٹھان نے پوچھا: ''مولانا! عطارہ معنی چہ''؟ حضرت نے فرمایا: ''زوجۂ عطر فروشندہ''، پٹھان نے کہا: ہم نہیں سمجھا، حضرت نے فرمایا: عطر فروش کی بیوی، پٹھان پھر نہیں سمجھا تو حضرت نے فرمایا: عطر بیچنے والا کا جورو۔ اب پٹھان خوش ہوا اور کہا: ہاں سمجھا، ہاں سمجھا۔

درس کے دوران مزاح: حضرت گنگوہیؒ جب پڑھاتے پڑھاتے تھک جاتے یا دیکھتے کہ طلبہ مرجھا رہے ہیں تو خود ہی کوئی ایسا لطیفہ چھوڑتے کہ طلبہ ہنستے ہنستے لوٹ پوٹ ہو جاتے، پیٹوں میں درد ہونے لگتا۔

مسالک کے بیان میں ائمہ کا احترام: دورانِ درس حضرت گنگوہیؒ مسالک کے بیان میں ہر مسلک کے دلائل کو شرح وبسط کے ساتھ بیان فرماتے، پھر مسلک حنفی کی ترجیح نہایت ہی واضح دلائل کی روشنی میں بیان فرماتے، آپ فرماتے کہ ''مجھے احناف کے مذہب سے خاص محبت ہے اور اس کی حقانیت پر کلی اطمینان ہے۔'' اس کے ساتھ ہی ترجیح مذہب کے وقت یہ ممکن نہ تھا کہ دوسرے مذہب کی توہین یا صاحبِ مذہب کی اہانت ہو اور کسی طالب علم کا میلان اس جانب دیکھتے تو قولاً وعملاً اس کی اصلاح فرماتے؛ یہاں تک کہ نفسِ تقلید میں بھی تعصب کا حد سے بڑھنا آپ کو پسند نہ تھا۔ (تذکرۃ الرشید ۱/۹۱)

اسباق کا سلسلہ:

۱۳۱۴ھ=۱۸۹۵ء میں آنکھ کی بینائی رخصت ہوگئی تھی۔ نزلہ کے پانی نے آنکھ کی پتلی کو گھیر لیا تھا۔ (تذکرۃ الرشید ص ۱۰۰) پھر بھی درس وافتاء اور افادۂ خلق کا سلسلہ جاری تھا۔

حدیث الجن: حضرت مولانا شاہ اہل اللہ دہلوی رحمۃ اللہ علیہ علیہ کو ایک جن صحابی سے ملنے اور اُن سے ایک حدیث شریف سننے کا شرف حاصل ہوا تھا، اس طرح کہ وہ مسجد میں بیٹھے تلاوت کر رہے تھے کہ ایک سانپ کا بچہ نکلا آپ نے اسے کسی چیز سے دو ٹکڑے کر دیے، تھوڑی دیر بعد ایک آدمی آیا اور بولا کہ آپ کو بادشاہ سلامت بلا رہے ہیں، شاہ صاحب نے سوچا کہ شاید شکار کے لیے آئے ہوں، جنگل میں پڑاؤ ڈالا ہو، کوئی مسئلہ پوچھنے بلا رہے ہیں؛ لیکن لے جانے والا زمین کے نیچے لے گیا، وہاں دربار لگا تھا، ایک نے شاہ صاحب پر قتل کا دعویٰ کیا کہ انھوں نے میرے بیٹے کو قتل کر دیا ہے، ان

کو بھی قصاص میں قتل کیا جائے، شاہ صاحب کو بڑی حیرت ہوئی، انھوں نے تو کسی کو قتل نہیں کیا تھا، اتنے میں ایک عمر دراز جن کھڑا ہوا اور اس نے کہا کہ ان کو قتل نہیں کیا جاسکتا، میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ایک حدیث شریف براہِ راست سنی ہے:

"مَنْ قُتِلَ في غَيْرِ زِيِّهِ، فَدَمُهُ هَدْرٌ".

(ترجمہ: جو اپنی خاص شکل کے علاوہ میں ہونے کی حالت میں قتل کردیا جائے تو اس کا خون رائیگاں ہے)

مدعی کا بچہ سانپ کی شکل میں تھا، قاتل نے سانپ سمجھ کر مارا ہے، جن سمجھ کر نہیں؛ اس لیے مدعی علیہ کو قصاص میں قتل نہیں کیا جاسکتا، یہ سن کر دعویٰ واپس لینا پڑا، اس وقت جن صحابی نے حضرت شاہ اہل اللہ صاحب سے مصافحہ کیا اور مذکورہ حدیث کی سند اور اس کو بیان کرنے کی اجازت مرحمت فرمائی، یہ حدیث حضرت شاہ عبدالعزیز، ابوسعید مجددی اور شاہ احمد سعید کے واسطہ سے حضرت گنگوہی کو پہنچی تھی، آپ اس کی اجازت بھی دیا کرتے تھے۔

حضرت تھانوی کو حدیث الجن کی اجازت: حضرت تھانوی علیہ الرحمہ نے حضرت گنگوہیؒ سے حدیث الجن کی اجازت اور اس کی سند مانگی تو آپ نے خط کے ذریعہ اجازت عنایت فرمائی، سند ملاحظہ فرمائیں:

''مولوی اشرف علی صاحب! السلام علیکم۔ آپ کا خط آیا، سندِ حدیث نقل کرتا ہوں:

حدثني شيخي الشاه أحمد سعيد المجددي، قال حدثني أبي الشاه أبو سعيد المجددى، قال حدثني شيخ الشيوخ الشاه عبدالعزيز الدهلوى، قال حدثني عمي الشاه أهل الله الدهلوي عن القاضي الجني العمر قال: سمعتُ رسول الله صلى الله عليه وسلم: مَنْ قُتِلَ في غَيْرِ زِيِّهِ فَدَمُهُ هَدْرٌ. (تذکرۃ الرشید ۱/۱۰۱)

آپ نے اس خط کے ذریعے حضرت تھانوی اور دیگر علماء کو اجازت عنایت فرمائی۔ تذکرۃ الرشید کو مواد اور تاریخ کے لحاظ سے یہ امتیاز حاصل ہے کہ اس میں حدیث الجن اور اس کی سند مذکور ہے، دوسری سوانح اس امتیاز سے خالی ہے۔

دیگر اسناد کی اجازت: حضرت گنگوہیؒ نے اپنے شاگرد حضرت مولانا محمد روشن شاہ مرادآبادیؒ کو بھی دوسری سندیں اپنے دستِ مبارک سے لکھ کر عنایت فرمائیں، اس پر تاریخ ۱۲۹۲ھ رقم ہے۔

شبہات وجواب: سوانح نگار نے تقریباً اسّی صفحات (۱۰۱ تا ۱۷۹) پر صاحب سوانح کے قیمتی

افادات نقل کیے ہیں، ''ش'' اور ''ج'' کا مخفف استعمال فرمایا ہے، ''ش'' شبہ کا اور ''ج'' جواب کا مخفف ہے، ان کی تفصیلات سے مقالہ دراز ہوگا؛ اس لیے انھیں چھوڑا جاتا ہے۔

فقہ اور افتاء: فتویٰ نویسی میں حضرت گنگوہیؒ کا امتیاز ناقابل انکار ہے، حضرت تدریس کے ساتھ فتویٰ نویسی بھی کرتے رہے، جب بینائی رخصت ہوگئی تو فتویٰ املا کرانے لگے، ان فتاویٰ کا ایک مجموعہ ''فتاویٰ رشیدیہ'' کے نام سے طبع ہو چکا ہے، اہلِ علم اس سے استفادہ کرتے ہیں، چند سال پہلے حضرت مولانا نورالحسن راشد کاندھلوی مدظلہٗ العالی نے ''باقیات فتاویٰ رشیدیہ'' کے نام سے ایک ضخیم جلد شائع فرمائی ہے، اس میں اُن فتاویٰ کو شاملِ اشاعت کیا ہے جو اب تک منتشر تھے۔

غرض یہ کہ ''تذکرۃ الرشید'' میں صفحہ ایک سواسّی سے صفحہ ایک سواٹھانوے تک ان فتاویٰ کو جمع فرمایا ہے جو سوانح کی تصنیف کے وقت میں سوانح نگار کی دست رس میں آئے تھے۔

صفحہ نمبر ایک سو بارہ اور تیرہ پر ''تفقہ اور افتاء'' کے عنوان سے سوانح نگار نے بڑے اچھے انداز میں حضرت گنگوہیؒ کی فقہی بصیرت پر قلم برداشتہ مضمون لکھا ہے۔

حضرت تھانویؒ کی مراسلت: تذکرۃ الرشید میں (۱/۱۱۴ تا ۱۳۶) حضرت تھانویؒ کی حضرت گنگوہیؒ سے کی گئی مراسلت نقل کی گئی ہے، یہ مراسلات اس لحاظ سے بڑی اہمیت کے حامل ہیں کہ ان سے حضرت تھانویؒ کی زندگی میں تبدیلی آئی، جامع العلوم کان پور میں تدریس کے زمانے میں بدعات کے سلسلے میں حضرت تھانوی نرم گوشہ تھے، حضرت گنگوہی نے اس پر نکیر فرمائی، بالآخر معتدل ہوگئے، پہلا خط عربی زبان میں ہے، اس میں بعض بدعات پر معذرت کا ذکر ہے جن کی وجہ سے حضرت گنگوہی ناراض تھے، جواب میں آپ نے معافی عنایت فرمائی، پھر علمی انداز میں چند بار مراسلات ہوئے ہیں، بالآخر اعتدال پر آگئے۔

دیگر مراسلات: اخیر میں تقریباً پچاس صفحات پر سوانح نگار نے واقعات حج کو لکھا ہے، پھر دارالعلوم دیوبند کے جلسۂ دستار بندی کا ذکر ہے، جس میں گیارہ فضلائے دارالعلوم کے سر پر عمامہ باندھا گیا ہے۔ اسی مضمون پر ''تذکرۃ الرشید'' کی پہلی جلد مکمل ہوئی ہے۔

''تذکرۃ الرشید'' میں مواد کی فراہمی کے وسائل

سوانح نگار نے سوانح نگاری میں جن وسائل سے کام لیا ہے، اُن کا ذکر آپ نے نہ تو ''تمہید'' میں کیا ہے؛ نہ ہی ''خاتمہ'' میں اور نہ ہی درمیان سوانح ان کے سلسلے میں کوئی وضاحت فرمائی ہے، راقم حروف کو مطالعے کے دوران چند شواہد ملے جن سے درج ذیل وسائل کا پتہ چلا ہے:

۱- مشاہدات: سوانح نگار کو صاحب سوانح کو دیکھنے اور برتنے کا موقع ملا، بار بار خدمت میں حاضری ہوتی رہی، کبھی ایک دن، کبھی دو دن، کبھی ہفتہ دو ہفتہ اس طرح پچاس ساٹھ یا اس سے کچھ زیادہ خدمت میں رہنے کا اتفاق ہوا، موصوف نے زندگی کے نشیب وفراز، نشست وبرخاست، مزاج ومذاق اور اوصاف وکمالات کو اپنے حافظے کے نہاں خانے میں بڑے محقق انداز میں محفوظ فرمایا؛ چنانچہ سوانح کا اکثر حصہ انھیں مشاہدات پر مبنی معلوم ہوتا ہے۔

۲- خاندان کے پس ماندگان سے مواد کی فراہمی: سوانح نگار نے صاحبِ سوانح کے خاندان کے بزرگوں اور دیگر پس ماندگان سے بھی بہت سی تفصیلات حاصل کی ہیں، یہ غیر دستاویزی تفصیلات ایسی ہیں جن سے سوانح کے مختلف گوشوں کی تکمیل ہوئی ہے، مثلاً خاندانی خصوصیات، حسب ونسب اور خاندانی شجرہ وغیرہ۔

۳- حضرت نانوتوی کی سوانح: حضرت مولانا محمد یعقوب نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ کی مختصر سوانح تحریر فرمائی تھی، ''سوانح قاسمی'' کی بنیاد اور اصل زمین یہی سوانح ہے، ''تذکرۃ الرشید'' کے مصنف نے اس سوانح سے بھی استفادہ فرمایا ہے صفحہ نمبر اٹھائیس پر اس کا حوالہ موجود ہے؛ اس لیے بلاشبہ مآخذ میں یہ شامل ہے کہ سوانح نگار نے اس سے بھی استفادہ فرمایا۔

۴- اليانع الجني في أسانيد الشيخ عبدالغني: یہ بیگوسرائے کی عظیم شخصیت، ترجمان خاندان ولی اللہی اور شاگرد رشید شیخ عبدالغنی حضرت شیخ محمد بن یحییٰ التیمی، ثم البکری، الترهتي، ثم القريني (۱۲۸۰ھ) کی تصنیف ہے۔ اور صرف چالیس صفحات پر مشتمل ہے۔ یہ بھی سوانح نگار کے پاس تھی، اب یہ تحقیق کے ساتھ چھپ گئی ہے۔ اس کا حوالہ بھی سوانح میں موجود ہے (تذکرۃ الرشید ۲۹/۱)۔ چوں کہ حضرت گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ نے حدیث شریف کی اکثر کتابیں حضرت شاہ عبدالغنی رحمۃ اللہ علیہ سے پڑھی تھی موصوف کی سند پوری تفصیل کے ساتھ مذکورہ کتاب میں موجود ہے؛ اس لیے اس کتاب سے بھی مواد درج فرمایا ہے۔

۵- بیاض: سوانح نگار نے بعض اندراجات ایسے نقل کیے ہیں جن سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ موصوف کے پاس صاحب سوانح کی بیاض ہوگی، مثال کے طور پر طبی نسخے (ص۶۲ تا ۷۲) یہ نہ تو اندازے سے لکھے جاسکتے ہیں اور نہ ہی سنی سنائی بات پر اس کا دارومدار ہوسکتا ہے، طبی واقعات اور کرشموں کو تو کہا جاسکتا ہے کہ یہ سن کر لکھے گئے ہوں گے؛ مگر بیماریوں کے علاج کے نسخے محض ظن

تخمین سے لکھے نہیں جاسکتے؛ اس لیے راقم الحروف کو اس پر اطمینان سا ہورہا ہے کہ سوانح نگار کے پاس صاحبِ سوانح کی ''بیاض'' ضرور ہوگی۔

۶-نقولِ فتاویٰ ومراسلات کا رجسٹر: ''تذکرۃ الرشید'' میں حضرت گنگوہیؒ کے چند فتاویٰ بھی نقل کیے گئے ہیں، اس سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ موصوف کے پاس فتاویٰ کا رجسٹر ضرور تھا، جس سے انھوں نے حسبِ خواہش چند فتاویٰ کو منتخب فرما کر نقل کیا۔

اسی طرح مراسلات کی تفصیلات سے اندازہ ہوتا ہے کہ آپ کے پاس نقولِ مراسلات کا رجسٹر بھی ضرور رہا ہوگا جس سے مواد کی فراہمی میں مدد ملی۔

۷-سوانح نگار کو صاحبِ سوانح کے ہاتھ سے لکھا ہوا ایک قیمتی رقعہ ملا، جس میں چوبیس باتیں ایسی لکھی ہیں جو احسان وسلوک کا خلاصہ ہیں، ان باتوں کو ملحوظِ خاطر رکھنے والا کبھی بھی تصوف و طریقت کا مخالف نہیں ہوسکتا، لکھتے ہیں:

''خوش قسمتی سے حضرت صاحب زادہ حکیم مولانا مسعود احمد صاحب کے پاس ایک پرچہ پر میری نظر پڑی جو طریقت کی ماہیت کے متعلق حضرت (مولانا رشید احمد گنگوہی) قدس سرہ کے دست مبارک کا لکھا ہوا تھا اور جس کو اوائل عمر میں خدا جانے کس ضرورت کے وقت قلمبند فرمایا تھا الخ۔ (تذکرۃ الرشید۲/۱۱)

غرض یہ کہ ''تذکرۃ الرشید'' کی تصنیف میں سوانح نگار نے ان کاغذات سے بھی مواد حاصل کیے ہیں جو صاحبِ سوانح کے ورثاء کے پاس موجود تھے۔

۸-۶/رمضان المبارک ۱۳۲۲ھ کو حضرت گنگوہیؒ نے ایک تقریر فرمائی تھی، مولانا برکت اللہ صاحب نے اسے قلمبند کرلیا تھا، سوانح کی ترتیب میں اس تقریر کو بھی سوانح نگار نے شامل فرمایا ہے، جس کی ابتداء اس طرح ہے:

''تمام اذکار واشغال ومراقبات وغیرہ کا خلاصہ یہ ہے کہ انسان کو اللہ تعالیٰ کی حضوری ہر وقت میسر رہے...الخ (تذکرۃ الرشید۲/۱۲)

۹-حضرت گنگوہیؒ کی وفات کے بعد جن لوگوں نے تاثراتی مضامین لکھے، اُن کو بھی سوانح نگار نے پیش نظر رکھا تھا، ان میں مفتی اعظم حضرت مفتی عزیز الرحمٰن صاحب عثمانی دیوبندی رحمۃ اللہ علیہ کا مضمون: "عند ذکر الصالحین تتنزل الرحمة" بھی ہے (موصوف کو حضرت گنگوہیؒ نے ہی دارالافتاء دارالعلوم دیوبند کے لیے مفتی اوّل کے طور پر منتخب فرمایا تھا (فتاویٰ دارالعلوم دیوبند۱/۳۴،

۳۶ مکتبہ دارالعلوم دیوبند پہلی اشاعت) چھتیس سال تک آپ نے دارالعلوم دیوبند میں فتویٰ نویسی کی، اٹھارہ جلدوں میں آپ کے فتاویٰ اب تک دارالعلوم دیوبند نے شائع کیے ہیں، بہت سی کتابوں کے مصنف ومترجم ہیں)

حضرت مفتی اعظمؒ نے اپنے مضمون میں حضرت گنگوہی کی زندگی کے اہم گوشوں کو جمع فرمایا ہے، آپ کے امتیازات، واقعات اور معمولات اسی طرح، علمی تفوق، جرأت ودلیری اپنے خواب اور حضرت گنگوہی کی تعبیرات اور اشعار وغیرہ سے مضمون کو مزین فرمایا ہے، اس مضمون میں کئی باتیں بڑی اہم ہیں:

(۱) اس میں حضرت گنگوہیؒ کا بیان کردہ وہ مسئلہ بھی ہے کہ چند میت کو اگر ایصالِ ثواب کیا جائے تو ثواب تقسیم ہوکر ہر ایک میت کو حصۂ رسد پہنچتا ہے۔ (تذکرۃ الرشید ص ۲۷) جب کہ دوسرے حضرات کے یہاں ہر میت کو پورا پورا ثواب ملتا ہے، اللہ تعالیٰ اپنے فضل سے تجزی وتقسیم نہیں فرماتے۔

(۲) دوسرا مسئلہ ''حیات انبیاء'' علیہم السلام کا ہے، اس کے بارے میں حضرت مفتی اعظمؒ حضرت گنگوہی کا مضمون اپنے الفاظ میں اس طرح نقل فرمایا ہے:

''موت سب کو شامل ہے؛ مگر انبیاء کی ارواح مشاہدۂ جمال وجلال حق تعالیٰ وتقابلِ آفتابِ وجود باری تعالیٰ سے اس درجہ پر پہنچ جاتے ہیں کہ اجزائے بدن پر اُن کا اثر ہوتا ہے کہ تمام بدن حکم روح پیدا کرلیتا ہے اور تمام جسم ان کا عینِ ادراک اور عینِ حیات ہوجاتا ہے اور یہ حیات دوسری قسم کی ہے۔'' (تذکرۃ الرشید ۲/۲۹)

پڑوسی ملک میں اس مسئلہ میں دو نظریہ وجود میں آگیا ہے، ایک حیاتی اور دوسرا مماتی کہلاتا ہے، اگر دونوں فریق حضرت گنگوہیؒ کی بات میں غور کرلیں تو اختلاف ختم ہوجائے؛ اس لیے کہ حضرت نے موت کو عام مانا ہے اور حیات کو دوسری قسم کی حیات کہہ کر تسلیم فرمایا ہے۔

(۳) ہم نے بارہا کتابوں میں پڑھا اور تقریروں میں سنا کہ ایک آیت ''أن ليس للإنسان إلّا ما سعىٰ'' کی تفسیر میں حضرت مفتی عزیز الرحمٰن عثمانیؒ کو شبہ ہوا، آپ نے راتوں رات گنگوہ کا پیدل سفر کیا، تہجد کے وقت پہنچے حضرت گنگوہیؒ تہجد کے لیے بیدار ہوچکے تھے، آپ نے برجستہ جواب عنایت فرمایا وغیرہ وغیرہ، ''تذکرۃ الرشید'' پڑھنے کے بعد معلوم ہوا کہ بیان کرنے والوں نے مضمون اگرچہ صحیح بیان کیا ہے؛ مگر سفر کا واقعہ اپنی طرف سے وضع کیا ہے۔ اس کی تفصیل ملاحظہ فرمائیں:

حضرت گنگوہیؒ سے مکاتبت: حضرت مفتی اعظمؒ کو حضرت گنگوہیؒ نے دارالافتاء کے لیے منتخب فرمایا تھا، اگر کوئی مشکل پیش آتی تو ملاقات کے وقت زبانی ورنہ خط کے ذریعہ اسے حل فرماتے تھے، انھیں میں سے ایک مکتوب ہے، جس میں حضرت کے ایک اشکال کا جواب ہے، حضرت مفتی اعظم اپنے ایک مضمون میں ارقام فرماتے ہیں (جس کو حضرت مولانا عاشق الٰہی میرٹھی رحمۃ اللہ علیہ نے تذکرۃ الرشید میں شامل فرمایا ہے):

''بندہ نے ایک عریضہ میں من جملہ چند سوالات کے ایک یہ بھی سوال کیا کہ آیت:

"وَأَنْ لَيْسَ لِلإنسان إلّا ما سعٰى."

(ترجمہ: اور انسان کے لیے بس وہی ہے جس کی اس نے کوشش کی)

سے معلوم ہوتا ہے کہ انسان کو سوائے اپنے اعمال کے دوسروں کے اعمال سے نفع نہیں پہنچتا؛ حالاں کہ احادیث سے نفع پہنچنا محقق ہے اور جمہور صحابہ وائمہ کا یہ مذہب ہے۔

اس کے جواب میں من جملہ دیگر جوابات معروضہ کے یہ معنی بھی ارقام فرمائے کہ "مَاسَعٰی" سے مراد ''سعیِ ایمانی'' لی جاوے تو پھر کچھ خدشہ اور تعارض نہیں؛ کیوں کہ حاصل اس صورت میں یہ ہے کہ انسان کو بدونِ سعی ایمانی وبلاحصول وتحقق ایمان کسی عمل سے نفع معتد بہ نہیں پہنچ سکتا، پس غیر کے اعمال کا نفع بھی اس کو اُسی وقت پہنچ سکتا ہے کہ اس کے اندر ایمان ہو اور سعی ایمانی اسی کی ہو؛ پس درحقیقت انسان کے لیے اپنی ہی سعی سے نفع پہنچتا ہے۔''

آگے مزید لکھتے ہیں:

''حضرت (گنگوہی) رحمۃ اللہ علیہ کے چند مکتوبات مطبوع ہوے تھے، اُن میں یہ مکتوب موجود ہے، مفصل اس میں دیکھ لیا جاوے۔'' (تذکرۃ الرشید، ج۱، ص۲۶-۲۷)

راقم حروف یہاں یہ بات عرض کرنا مناسب سمجھتا ہے کہ بہت سی تحریروں اور تقریروں میں یہ بات دیکھنے اور سننے کو ملی کہ ''حضرت مفتی عزیز الرحمٰن عثمانی دیوبندی رحمۃ اللہ علیہ کو رات کے وقت مذکورہ بالا آیت میں اشکال پیش آیا اور آپ نے راتوں رات گنگوہ کا سفر کیا اور حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ نے تہجد کے وقت برجستہ جواب دیا، حضرت مفتی فضیل الرحمٰن ہلال عثمانی مدظلہ العالی نے بھی اپنے دادا کی سوانح (فقیہِ اعظمؒ) میں اس واقعہ کو لکھا ہے، یہ ساری تفصیلات بے اصل ہیں، صحیح بات وہ ہے جو حضرت مفتی اعظمؒ نے خود اپنے قلم سے تحریر فرمائی ہے کہ ایک عریضہ (خط) کے جواب میں اس اشکال کا جواب عنایت فرمایا تھا۔

۱۰- مکاتیب رشیدیہ: سوانح نگار کے پاس مکاتیب رشیدیہ بھی تھی، اس سے بھی بعض خطوط آپ نے نقل کیے ہیں، مثلاً ''تذکرۃ الرشید'' کی دوسری جلد کے صفحہ نمبر ستاون پر ایک خط نقل فرمایا ہے، جو حکیم عبدالعزیز خان کے نام ہے۔

۱۱- یادیاراں: سوانح نگار کو حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ نے حضرت گنگوہی پر ایک تفصیلی مضمون لکھ ارسال فرمایا، جس کا عنوان تھا: ''یاد یاراں'' موصوف نے اسے بھی شامل سوانح کیا۔ (تذکرۃ الرشید۲/۸۴)

۱۲- پندرہ ارشادات: حضرت مولانا صادق الیقین کرسویؒ نے حضرت گنگوہی کے ارشادات کو جمع فرمایا تھا، سوانح نگار نے ان میں سے پندرہ ارشادات تبرک کے طور پر سوانح میں شامل فرمائے ہیں۔ (تذکرۃ الرشید۲/۲۵۱-۲۵۳)

حضرت گنگوہیؒ اور ذوق شعری: سوانح نگار نے سارے اوصاف کے ساتھ یہ حسین وصف بھی بیان فرمایا ہے کہ حضرت گنگوہیؒ کو شعر گوئی سے کوئی خاص مناسبت نہیں تھی، (تذکرۃ الرشید۲/۷۵) یہ صفت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی صفاتِ حمیدہ میں سے ہے، جن کے بارے میں قرآنِ پاک نے صاف صاف واضح کردیا:

وَمَا عَلَّمْنَاهُ الشِّعْرَ وَمَا يَنْبَغِي لَهُ.

ترجمہ: اور ہم نے اُن کو (نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو) شعر گوئی نہیں سکھائی اور (یہ) آپ کے لیے مناسب بھی نہیں۔

اس کے باوجود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم دوسرے شعراء کے اشعار کبھی برجستہ پڑھ بھی دیتے تھے اور کبھی اس نقل میں بھی غلطی ہوجاتی تھی، تو حضرت عائشہؓ اور حضرت ابوبکر صدیقؓ وغیرہ جو مجلس میں ہوتے تھے، بتاتے بھی تھے کہ وہ شعر جو آپ نے پڑھا ہے، وہ اصلاً اس طرح ہے۔ ظاہر ہے کہ اگر اللہ رب العالمین باضابطہ شعر گوئی سکھاتے اور اس سے مناسبت عطا فرماتے تو یہ صورت پیش نہ آتی۔

حضرت گنگوہیؒ بھی شعر گوئی سے مناسبت نہیں رکھتے تھے؛ مگر کبھی اردو اور فارسی کے برجستہ اشعار اُن کی زبان پر آجاتے تھے وہ بھی اساتذۂ فن کے اشعار، اس سے حضرت کے بیان میں حسن پیدا ہوجاتا تھا، اس کی چند مثالیں پیش کرنا مناسب معلوم ہوتا ہے:

(۱) ایک بار آپ کے اوپر سحر ہوگیا تو آپ کے شاگرد حضرت مولانا خلیل احمد سہارنپوریؒ نے آپ کے پاس ایک عامل کو بھیجا، حضرت گنگوہیؒ کو من جانب اللہ معلوم ہوگیا کہ یہ اُسی عامل کا مرید

ہے، جس نے مجھے سحر کیا ہے، حضرت نے اس کو لطیف حیلے سے واپس فرمادیا اور جب حضرت مولانا سہارنپوریؒ سے ملاقات ہوئی تو آپ نے برجستہ میرؔ کا ایک شعر پڑھا:

میرؔ کیا سادہ ہیں، بیمار ہوے جس کے سبب اسی عطار کے لونڈے سے دوا لیتے ہیں

(تذکرۃ الرشید۲/۷۵)

(۲) ایک بار مولانا محمد یحییٰ صاحب کہیں چلے گئے، حضرت نے بار بار یاد کیا؛ مگر نہ آئے، جب دیر کے بعد خدمت میں حاضر ہوئے تو آپ نے برجستہ یہ شعر پڑھا:

مت آئیو، اُو وعدہ فراموش تو اب بھی جس طرح کٹا روز گزر جائے گی شب بھی

(تذکرۃ الرشید۲/۷۶)

(۳) بعض موقع سے درج ذیل اشعار بھی پڑھا کرتے تھے:

(الف) وہ نہ آئیں تو تو ہی چل رنگیں اس میں کیا تیری شان جاتی ہے

(ب) کیا کہوں جرأت کہ کچھ بھاتا نہیں کچھ تو بھایا ہے کہ کچھ بھاتا نہیں

(ج) مرا اک کھیل خلقت نے بنایا تماشہ کو بھی تو میرے نہ آیا

(تذکرۃ الرشید۲/۷۶-۷۷)

(د) از صحن خانہ تا بہ لب بام ازاں من و از سقف خانہ تا بہ ثریا ازاں تو

* * *

احوال و کوائف

دارالعلوم دیوبند میں کل ہند رابطہ مدارس اسلامیہ عربیہ کی مرکزی مجلس عاملہ کا اہم اجلاس اختتام پذیر

==========

''مورخہ ۵؍ربیع الثانی ۱۴۴۵ھ مطابق ۲۱؍اکتوبر ۲۰۲۳ء ہفتہ کو کل ہند رابطہ مدارس اسلامیہ دارالعلوم دیوبند کی مرکزی مجلس عاملہ کا اہم اجلاس مہمان خانۂ دارالعلوم میں حضرت مولانا مفتی ابوالقاسم نعمانی صاحب مہتمم وشیخ الحدیث دارالعلوم دیوبند وصدر رابطہ مدارس اسلامیہ کی صدارت میں منعقد ہوا، اجلاس کی دو نشستیں ہوئیں: پہلی نشست کا آغاز صبح نو بجے جناب قاری عبدالرؤف صاحب بلندشہری استاذ تجوید وقرارت دارالعلوم دیوبند کی تلاوت قرآن سے ہوا۔

اجلاس میں نظامِ تعلیم وتربیت کے استحکام، تدریب المعلمین کا نظام، اصلاحِ معاشرہ کی جدوجہد، بڑھتے ہوئے ارتدادی سرگرمیوں کی روک تھام، مدارس اسلامیہ میں عصری تعلیم کے نظام اور ملک میں مکاتب کے قیام کی تحریک وغیرہ سے متعلق اہم فیصلے لیے گئے۔

دارالعلوم دیوبند کے مہتمم وشیخ احدیث حضرت مولانا مفتی ابوالقاسم صاحب نعمانی زیدمجدہم صدر کل ہند رابطہ مدارس اسلامیہ عربیہ دارالعلوم دیوبند نے اجلاس میں ملک بھر سے تشریف لائے ہوئے مرکزی مجلس عاملہ کے ارکان ومدعوین خصوصی اور نمائندگان کو صدارتی خطاب کرتے ہوئے فرمایا:

'' یہ اجلاس کل ہند رابطہ مدارس اسلامیہ دارالعلوم دیوبند کی مرکزی مجلس عاملہ کا ہے، رابطہ مدارس کا مقصد مدارس اسلامیہ کو فعال بنانا اور تعلیم وتربیت کے نظام کو مستحکم کرنا، مدارس کو درپیش مسائل کو باہمی مشورے سے حل کرنا ہے''۔

''ملک کے تیزی سے بدلتے ہوئے حالات میں ہم خدام مدارس کو تحفظ واستحکام مدارس، مکاتب کے قیام، باہمی ربط واتحاد کو فروغ دینے میں اہم کردار ادا کرنا ہے۔''

اُس دن کے اخبار میں چھپی خبر ''یوپی کے چار ہزار مدارس کی جانچ ہوگی'' کی طرف حضرت والا نے توجہ دلاتے ہوئے فرمایا کہ یوپی حکومت نے صوبے کے مدارس کی جانچ کے لیے ایک کمیٹی تشکیل دی ہے، یہ کمیٹی مدارس کی فنڈنگ، حقوق اطفال کی پاسداری، صفائی ستھرائی، مدارس کے نظام، حساب

وکتاب اور دیگر امور سے متعلق جانچ کرے گی، آج کی مجلس میں اس پر غور بھی ہونا چاہیے، گذشتہ سروے میں ثابت ہوا ہے کہ جو مدارس کسی ادارے سے ملحق ہیں اس کے ساتھ حکومت نے رعایت برتی ہے؛ اس لیے بعض علاقوں سے الحاق سے متعلق موصول ہونے والی درخواستوں کے بارے میں غور ہونا چاہیے۔ ارتدادی سرگرمیوں کی روک تھام کی طرف توجہ دلاتے ہوئے فرمایا کہ ہمارے اکابر نے اس سے نپٹنے کے لیے مکاتب کا نظام قائم کیا تھا، ضروری ہے کہ مزید مکاتب کا قیام عمل میں لایا جائے اور اس میں کل وقتی اور جز وقتی (صباحی ومسائی) نظام کے تحت تعلیم کا نظم کیا جانا چاہیے۔

دارالعلوم دیوبند کے صدر المدرسین حضرت مولانا سید ارشد مدنی زید مجدہم صدر جمعیۃ علماء ہند نے فرمایا:

''مدارس اسلامیہ کا اسلام کی حفاظ واشاعت، دینی تعلیم وتربیت کے فروغ اور ملت کی خدمت میں بڑا کردار رہا ہے، ملک کی موجودہ صورت حال میں اسلام، مسلمانوں اور مدارس اسلامیہ کے لیے حالات بڑے صبر آزما اور ہمت شکن ہیں؛ لیکن ہم کو اکابر کے نقش قدم پر چلتے ہوئے مدرسوں کے نظام کو فعال ومستحکم بنانا ہوگا اور ان کی نافعیت کو بڑھانا ہوگا اور ایسے طریقہ کار کو اختیار کرنا ہوگا جس سے ملک وملت کے لیے اچھے افراد اور دینی دعوت وخدمت کے لیے باصلاحیت علماء فراہم ہوں، اصول ہشت گانہ کے مطابق نظامِ مدارس کو استوار کیا جائے، اخلاص وللّٰہیت اور حسن نیت کے ساتھ عواقب کو سمجھتے ہوئے کام کریں، سرکاری امداد سے اجتناب بھی ضروری ہے۔''

دیگر اظہار خیال کرنے والوں میں حضرت مولانا نعمت اللہ صاحب اعظمی زید مجدہم استاذ حدیث دارالعلوم، حضرات ارکان شوریٰ دارالعلوم دیوبند میں حضرت مولانا رحمت اللہ صاحب میر قاسمی زید مجدہم، حضرت مولانا محمود حسن صاحب کھیروی زید مجدہم، حضرت مولانا محمد عاقل صاحب گڈھی دولت اور حضرت ارکان عاملہ ومدعوین خصوصی میں جناب مولانا صدیق اللہ صاحب چودھری مغربی بنگال، جناب مولانا قاری شوکت علی صاحب ویٹ، جناب مولانا مفتی اشفاق احمد صاحب سرائے میر، جناب مولانا مفتی احمد دیولوی صاحب گجرات، جناب مولانا عبدالقوی صاحب حیدرآباد کے اسمائے گرامی شامل ہیں۔

مولانا شوکت علی قاسمی بستوی ناظم عمومی رابطہ مدارس واستاذ حدیث دارالعلوم نے رابطہ کی گذشتہ مجلس عاملہ کی کارروائی پڑھی اور مرکزی رابطہ کی سالانہ رپورٹ پیش کی جس میں مختلف صوبوں کی کارکردگی کا جائزہ بھی پیش کیا گیا۔

سوا بارہ بجے دوپہر کو صدر اجلاس حضرت مولانا مفتی ابوالقاسم صاحب نعمانی دامت برکاتہم مہتمم و شیخ الحدیث دارالعلوم دیوبند وصدر رابطہ مدارس اسلامیہ عربیہ کی دعا پر نشست اول کا اختتام عمل میں آیا۔

اجلاس کی دوسری نشست کا آغاز حضرت مولانا مفتی ابوالقاسم صاحب نعمانی زیدمجدہم کی زیر صدارت مہمان خانہ دارالعلوم میں مورخہ ۵؍ربیع الثانی ۱۴۴۵ھ کو بعد نماز مغرب جناب قاری محمد ارشاد صاحب استاذ تجوید وقراءت دارالعلوم دیوبند کی تلاوت قرآن سے ہوا۔

مرکزی مجلس عاملہ کے ارکان ومدعوین خصوصی کو خطاب کرتے ہوئے دارالعلوم دیوبند کے صدرالمدرسین حضرت مولانا سید ارشد صاحب مدنی زیدمجدہم وصدر جمعیۃ علماء ہند نے توجہ دلائی کہ نظام تعلیم میں پختگی کے لیے ضروری ہے کہ ذمہ داران مدارس عربی درجات کے ابتدائی تین سالوں کی تعلیم پر بھرپور توجہ دیں اور دارالعلوم دیوبند کے نہج پر ابتدائی جماعتوں میں پڑھانے والے حضرات مدرسین کو تربیت دی جائے۔

اجلاس میں اُس دن کے اخبار میں چھپی یوپی کے خبر ''یوپی کے ۴؍ہزار مدرسوں کی پھر جانچ ہوگی'' پر حضرت مولانا نعمت اللہ صاحب اعظمی دامت برکاتہم نے گفتگو فرمائی اور تشویش کا اظہار کیا، حضرت مولانا رحمت اللہ صاحب میر قاسمی زیدمجدہم نے نظام تعلیم پر اظہار خیال فرمایا، حضرت مولانا محمود حسن صاحب کھیروی زیدمجدہم نے اساتذہ کی تربیت پر زور دیا، حضرت مولانا محمد عاقل صاحب زیدمجدہم گڑھی دولت نے حفظ وتجوید کے اساتذہ کی تربیت پر گفتگو کی، حضرت مولانا مجیب اللہ صاحب گونڈوی نے طلبہ کی استعدادسازی پر زور دیا، حضرت مولانا مفتی محمد راشد صاحب اعظمی، نائب مہتمم دارالعلوم دیوبند نے ''مدارس اسلامیہ میں عصری تعلیم'' پر اظہار خیال فرمایا، حضرت مولانا حسین احمد صاحب ہریدواری ناظم مجلس تعلیمی دارالعلوم نے بعض تعلیمی اموراور امتحان کے نظام پر توجہ دلائی، جناب مولانا مفتی محمد صالح صاحب مظاہری امین عام مظاہرعلوم سہارنپور نے طلبۂ مدارس کی فکری تربیت پر زور دیا، جناب مولانا مفتی محمد عفان منصورپوری نے ملک میں منظّم مکاتب کے سلسلے میں تجاویز پیش کیں۔

کل ہند رابطہ مدارس کے ناظم عمومی جناب مولانا شوکت علی قاسمی بستوی نے مجلس عاملہ کے اس اجلاس میں فلسطین میں جاری اسرائیلی جارحیت وبربریت پر گہری تشویش کا اظہار کرتے ہوئے تجویز بھی پیش فرمائی جو اتفاق رائے سے منظور کی گئی، تجویز میں فلسطین میں اسرائیل کی وحشیانہ بم باری، غزہ کے ہزاروں معصوم باشندگان کی حتی کہ بچوں اور خواتین کی مسلسل ہلاکت، غذا، پانی، ادویات اور بجلی کا انقطاع اور شہری علاقوں، مسجدوں، اسپتالوں پر مسلسل بم برسائے جانے کی شدید مذمت کرتے

ہوئے عالمی برادری سے اور اقوام متحدہ سے مطالبہ کیا گیا کہ ظالم وغاصب اسرائیل کو پابند کیا جائے کہ وہ اپنی ظالمانہ کارروائی، غزہ سے لاکھوں بے قصور ومظلومین کے انخلاء اور مسجد اقصیٰ کی بے حرمتی سے باز آئے، فلسطینیوں کے زمینوں پر اسرائیل کا غاصبانہ قبضہ ختم کرایا جائے اور فلسطینی عوام کے شہری اور انسانی حقوق بحال کیے جائیں۔

ملک کے حکمراں طبقے سے بھی اپیل کی گئی کہ فلسطین کے تئیں ہندوستان کی سابقہ پالیسی پر کاربند رہا جائے، فلسطینیوں کی حمایت کی جائے۔ اسرائیل کی جارحیت وبربریت اور امریکہ وبرطانیہ وغیرہ کی اسرائیل نوازی کی پُرزور مذمت کی گئی اور مطالبہ کیا گیا کہ

(الف) خودمختار آزاد فلسطینی ریاست کے قیام میں حائل رکاوٹیں دور کی جائیں۔

(ب) غزہ اور فلسطین کے بے قصور وبے گھر عوام پر مظالم بند کیے جائیں اور ان کی بازآبادکاری کا معقول انتظام کیا جائے۔

(ج) اقوام متحدہ اور عالمی برادری اسرائیل سے عرب مقبوضہ علاقوں کو فوراً خالی کرائے۔

اجلاس میں درج ذیل حضرات علماء کرام، دانشوران ملت، ارکان عاملہ اور بہی خواہان کے لیے تجویز تعزیت بھی منظور کی گئی:

(۱) حضرت مولانا سیّد رابع حسنی ندوی صاحب رکن شوریٰ دارالعلوم دیوبند وصدر آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ، (۲) حضرت مولانا مفتی محمد رفیع عثمانی صاحب صدر جامعہ دارالعلوم کراچی وسرپرست وفاق المدرس، (۳) حضرت مولانا سیّد محمد شاہد الحسنی صاحب امین عام جامعہ مظاہر علوم سہارن پور ورکن مجلس عاملہ رابطہ مدارس، (۴) جناب مولانا محمد اسلام صاحب قاسمی استاذ دارالعلوم وقف دیوبند، (۵) جناب مولانا طاہر حسین صاحب گیاوی، بہار (مشہور مناظر) (۶) جناب الحاج سید گلزار احمد اعظمی صاحب، سکریٹری قانونی امداد کمیٹی جمعیۃ علماء مہاراشٹر (۷) جناب مولانا قمرالدین صاحب جونپوری (۸) جناب مولانا ظہور احمد صاحب، صدر جمعیۃ علماء ضلع سہارنپور (۹) جناب مولانا محمد اسلام صاحب سابق کارکن دارالافتاء دارالعلوم دیوبند (۱۰) جناب مولانا مستقیم احسن صاحب اعظمی (۱۱) جناب ڈاکٹر محمد اسمٰعیل صاحب، کناڈا (۱۲) جناب ایڈووکیٹ ظفریاب جیلانی صاحب، لکھنؤ (۱۳) جناب مولانا انعام الحسن صاحب منگراواں اعظم گڈھ (۱۴) جناب مولانا عبدالولی صاحب فاروقی، لکھنؤ (۱۵) والدہ محترمہ جناب مولانا خضر محمد صاحب کشمیری استاذ دارالعلوم دیوبند۔

دیگر شرکاء میں حضرت مولانا عبدالخالق صاحب مدراسی، نائب مہتمم دارالعلوم دیوبند، حضرت

مولانا مفتی محمد امین صاحب پالن پوری، حضرت مولانا مفتی محمد یوسف صاحب تاؤلوی، حضرت مولانا محمد نسیم صاحب بارہ بنکوی اساتذۂ حدیث دارالعلوم دیوبند، جناب مولانا ریاست علی صاحب اتراکھنڈ، جناب مولانا قاری محمد امین صاحب راجستھان، جناب مولانا عبدالقادر صاحب آسام، جناب مولانا زین العابدین صاحب کرناٹک، جناب مولانا علی حسن صاحب مظاہری شمالی ہریانہ، جناب مولانا محمد فاروق صاحب اڈیشہ، جناب مولانا مفتی سراج ماحمد صاحب منی پور، جناب مولانا داؤدظفر صاحب دہلی، جناب مولانا محمد خالد صاحب قاسمی جنوبی ہریانہ، جناب مولانا محمد ابراہیم صاحب کیرالا، جناب مولانا مفتی صلاح الدین صاحب تمل ناڈو، جناب مولانا مفتی محمد اقبال صاحب تمل ناڈو، جناب مولانا منظور عالم صاحب ہگلی مغربی بنگال، جناب مولانا محمد ممتاز صاحب شملہ ہماچل، جناب مولانا محمد احمد خان صاحب مدھیہ پردیش، جناب مولانا مرغوب الرحمٰن صاحب بہار، جناب مولانا سعید احمد حبیب صاحب پونچھ کشمیر، جناب مولانا عبدالقدیم صاحب ہاپوڑ، جناب مولانا محمد اسحاق صاحب جھارکھنڈ، جناب مولانا شوکت علی صاحب جھن جھنوں راجستھان، جناب مولانا مفتی اقبال احمد قاسمی کان پور، جناب مولانا مفتی محمد خلیل صاحب قاسمی پنجاب، جناب مولانا محمد صاحب رانچی جھارکھنڈ، جناب مفتی طیب الرحمٰن صاحب تری پورہ، جناب مولانا عنایت اللہ صاحب جموں، جناب مفتی محمد محسن صاحب اورنگ آباد، جناب مفتی شاکر خاں صاحب پونہ، جناب مولانا عبداللہ صاحب سہارنپور، جناب مولانا امیر اللہ خاں صاحب تلنگانہ۔

اجلاس کی دونوں نشستوں میں نظامت کے فرائض ناظم عمومی رابطہ مولانا شوکت علی قاسمی بستوی نے انجام دیے اور صوبائی شاخوں کی کارکردگی کا جائزہ پیش کیا اور مہمان کرام کا شکریہ بھی ادا کیا، پونے نو بجے شب کو حضرت مولانا سیّد ارشد مدنی زید مجدہم صدر المدرسین دارالعلوم دیوبند وصدر جمعیۃ علماء ہند کی دعا پر مجلس عاملہ کے اجلاس کی دوسری نشست کا اختتام عمل میں آیا۔

رابطہ مدارس کی مجلس عاملہ کے اجلاس کے موقع پر مہمانان کرام کے قیام وطعام اور انتظامی امور میں جدید مہمان خانہ دارالعلوم میں جناب مولانا عمران اللہ صاحب، جناب مولانا جرار احمد صاحب اساتذۂ دارالعلوم، مولوی اسعد اللہ صاحب (شعبۂ تحفظ ختم نبوت) مولوی فضیل احمد صاحب (شعبۂ خرید وفروخت) کا اور قدیم مہمان خانہ دارالعلوم میں جناب مولوی محمد مقیم الدین صاحب ودیگر عملہ کا گراں قدر تعاون شامل رہا۔ مولوی محمد فردوس عالم کارکن دفتر رابطہ مدارس، دفتری اور دیگر انتظامی امور میں معاون رہے۔

تجویز منظور کردہ

اجلاس مجلس عاملہ رابطہ مدارس اسلامیہ عربیہ دارالعلوم دیوبند

منعقدہ ۵؍ربیع الثانی ۱۴۴۵ھ مطابق ۲۱؍اکتوبر ۲۰۲۳ء بروز شنبہ

بہ مقام: مہمان خانہ دارالعلوم دیوبند

فلسطین میں اسرائیلی مظالم کی مذمت

کل ہند رابطۂ مدارس اسلامیہ عربیہ دارالعلوم دیوبند کی مجلس عاملہ کا یہ اہم اجلاس فلسطین میں جاری اسرائیل کی وحشیانہ بم باری کی شدید مذمت کرتا ہے، ہزاروں معصوم، انسانی جانوں حتیٰ کہ ہزاروں افراد خصوصاً بچوں اور خواتین کو شہید کردیا گیا، نیز لاکھوں افراد کو ان کے گھروں سے نکلنے پر مجبور کردیا گیا، حتی کہ وہ ضروری سہولیات پانی، بجلی اور دواؤں سے محروم کردیے گئے ہیں، شہری علاقوں، مسجدوں، اسپتالوں پر مسلسل بم برسائے جارہے ہیں اور معصوم ومظلوم فلسطینی باشندوں پر ظلم کے پہاڑ توڑے جارہے ہیں، ہم اس کی شدید مذمت کرتے ہیں اور عالمی برادری سے پُرزور مطالبہ کرتے ہیں کہ وہ ظالم وغاصب اسرائیل پر دباؤ بنائیں کہ وہ اپنی ظالمانہ کارروائیاں فوراً بند کرے، غزہ کے انخلاء اور مسجد اقصیٰ کی بے حرمتی سے باز آئے، فلسطینیوں کی زمینوں پر اسرائیل کا قبضہ ختم کرایا جائے اور فلسطینی عوام کے شہری اور انسانی حقوق بحال کیے جائیں، ملک کے حکمراں طبقے سے اپیل ہے کہ فلسطین کے تئیں ہندوستان کی سابقہ پالیسی پر کاربند رہا جائے۔

یہ اجلاس اسرائیل کی جارحیت وبربریت اور امریکہ وبرطانیہ وغیرہ کی اسرائیل نوازی اور حمایت کی پُرزور مذمت کرتا ہے اور مطالبہ کرتا ہے کہ

(الف) خودمختار آزاد فلسطینی ریاست کے قیام میں حائل رکاوٹیں دور کی جائیں۔

(ب) فلسطین اور غزہ کے مظلوم عوام پر مظالم بند کیے جائیں اور ان کی بازآبادکاری کا معقول انتظام کیا جائے۔

(ج) اقوام متحدہ اور عالمی برادری اسرائیل سے عرب مقبوضہ علاقوں کو فوراً خالی کرایا جائے۔